ضرورتِ رسالت

مکمل و مدلل

تالیف

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولینا سلطان محمود رحمۃ اللہ علیہ

ملنے کا پتہ

مدرسہ خادم علوم نبوت
کٹھیالہ شیخاں ○ ضلع گجرات

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ
عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝

رسالہ مفید سب مسلمانوں کے لیے عموماً
اور مدارس کے طالب علموں کے لیے خصوصاً

ضرورت رسالت

ہر دو حصہ مکمل

تالیف

شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا سلطان محمود رحمۃ اللہ علیہ
سابق صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی

ترتیب

خادم العلماء محمد اسد اللہ غفرلہ اللہ خطیب الجامع کٹھیالہ شیخاں ضلع گجرات

ملنے کا پتہ

مدرسہ خادم علوم نبوت ——— کٹھیالہ شیخاں ضلع گجرات

51

ہدیہ [redacted] روپے صرف

نام کتاب ——— ضرورتِ رسالت مکمّل ومدّلل

مصنف ——— حضرت مولانا سلطان محمود رحمۃ اللہ علیہ

مرتب وناشر ——— خادم العلماء محمد اسد اللہ غفر لہ اللہ

کتابت ——— احقر محبوب احمد خوشنویس چک ۳۸

مطبع ——— گلستان پریس جناح مارکیٹ سرگودھا

تاریخ طبع ثانی ——— جمادی الاوّل ۱۴۰۵ھ

ملنے کے پتے

مدرسہ خادم علوم نبوّت کٹھیالہ شیخاں ضلع گجرات

مدرسہ دار العلوم المدنیہ (رجسٹرڈ) چنیوٹ ضلع جھنگ

مکتبہ حسینیہ جامعہ ضیاء العلوم بلاک نمبر ۱۸ سرگودھا

کتاب ہذا کا مختصر تعارف

اس رسالہ میں نبوت ورسالت کے تمام پہلو دلائل عقلیہ ونقلیہ سے واضح کیئے گئے ہیں اور اس رسالہ کے دو حصّے کر دیئے گئے ہیں حصّہ اول میں مطلق نبوّت و رسالت کی تشریح کی گئی ہے جو مشترک ہے تمام انبیاء علیہم السلام میں اور حصّہ دوم میں خاص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افضل الرسل وخاتم الانبیاء ہونے کی تشریح ہے اور ان دونوں حصّوں میں اصل مسئلہ کی تشریح کے علاوہ مخالفین اسلام کی تردید بھی نہایت مدلّل طریقہ سے کی گئی ہے خصوصاً مرزائیوں اور عیسائیوں کی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ و لو کرہ المشرکون و الصلوٰۃ و السلام علیٰ رسولہ النبی الامی خاتم الانبیاء رحمۃ للعلمین و علیٰ اٰلہ و اصحابہ اجمعین۔

امابعد برادرانِ اسلام! خداوند تعالیٰ نے جس دن سے نوعِ انسان کو دنیا میں آباد کیا ہے اسی دن سے سلسلہ انبیاء علیہم السلام جاری فرما کر بنی نوعِ انسان کی اصلاح کا انتظام بھی فرما دیا ہے حتیٰ کہ پہلا انسان نبی ہی تھا یعنی حضرت آدم علیہ السلام۔

انسان کی اصلاح کے دو حصے ہیں، اصلاحِ عمل، اصلاحِ اعتقاد، اور دونوں حصوں میں سے اصلاحِ اعتقاد مقدم و اہم ہے اس لیے کہ عمل کی صحت و درستی اعتقاد کی صحت و درستی پر موقوف ہے، اگر اعتقاد خراب ہو تو عمل صحیح ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اعتقاد بمنزلہ اصل کے ہے اور عمل بمنزلہ فرع ہے اور جب تک اصل درست نہ ہو فرع کی درستی ممکن ہی نہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص کا اعتقاد یہ ہو کہ اللہ تعالےٰ کے ماسوا اور چیزیں بھی قابل پرستش ہیں، مثلاً سورج وغیرہ تو وہ کبھی ایک خداوند تعالیٰ کی پرستش و عبادت مخلصانہ کر ہی نہیں سکتا اس بنا پر اعتقاد کی اصلاح مقدّم اور اہم ہے یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام اوّل اصلاحِ اعتقاد کی طرف متوجہ ہوتے رہے ہیں اور اس کے بعد اصلاحِ اعمال کی طرف۔

اور تمام مسائلِ اعتقادیہ میں سب سے زیادہ مہتم بالشان تین مسئلے ہیں، توحید[۱]، یعنی خداوند تعالےٰ کو وحدہٗ لاشریک لہٗ سمجھنا، رسالت[۲] یعنی تمام رسولوں کو سچا تسلیم کرنا، مجازات[۳] یعنی اعمال کی جزا و سزا کا قائل ہونا اور قیامت کے دن کو برحق ماننا۔ قرآن شریف نصف سے زیادہ فقط انہی تین مسئلوں کے بیان میں ہے، بار بار مختلف عنوانوں میں ان تین مسائل

کو بیان کیا گیا ہے اور طرح طرح کے دلائل سے واضح کیا گیا ہے۔

زمانۂ حال میں اکثر لوگ ان مسائل کی حقیقت سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے طرح طرح کی خرابیوں میں مبتلا ہیں، حالتِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے ضروری معلوم ہوا کہ ان تین مسائل کے متعلق مختصر طور پر تین رسالے تالیف کروں گو میری قابلیت تو اس لائق نہیں تھی کہ ایسے اہم مسائل میں قلم اُٹھاتا مگر خیر خواہیِ بنی نوعِ انسان نے مجبور کیا کہ جس قدر ہو سکے اسی قدر تحریر میں لایا جائے لہٰذا خداوند تعالےٰ پر بھروسہ کرتے ہوئے اوّل مسئلہ رسالت شروع کرتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ خداوند تعالےٰ توفیق عطا فرمائے کہ اس مسئلہ سے فارغ ہو کر باقی دو مسئلوں کو بھی تحریر میں لاؤں، آمین۔

پیغمبروں کے بھیجنے کی ضرورت

میں مناسب سمجھتا ہوں کہ سب سے پہلے اس امر کو واضح کر دوں کہ انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے لیکن اس امر کی وضاحت کے لیے اوّل چند مقدمات کو بطورِ تمہید ذکر کیا جاتا ہے تاکہ مقصد کے ذہن نشین ہونے میں آسانی ہو۔

پہلا مقدّمہ

کسی ذی عقل پر یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ انسان پر خداوند تعالیٰ کی اطاعت و رضا جوئی فرض و لازم ہے۔ دلیل اس مقدمہ کی یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ خالق اور انسان مخلوق، خداوند تعالےٰ مالک انسان مملوک، خداوند تعالےٰ حاکم انسان محکوم، خداوند تعالےٰ رازق انسان مرزوق، خداوند تعالےٰ محبوب اور انسان محب، ظاہر ہے کہ مخلوق پر خالق کی رضا جوئی فرض ہے اور مملوک پر مالک کی رضا جوئی لازم ہے اور محکوم پر حاکم کی رضا جوئی واجب ہے اور مرزوق پر رازق کی رضا جوئی ضروری ہے اور محب کا محبوب کی رضا جوئی میں مر مٹنا ہی عاشقوں کا شیوہ ہے خصوصاً محبوب بھی ایسا کہ تمام دنیا کے محبوب بھی اس کے دست نگر ہوں، ان باتوں میں سے ایک بات کا ہونا بھی رضا جوئی کے فرض ہونے کے لیے کافی ہے، حالانکہ خداوند تعالیٰ میں تو

یہ تمام باتیں موجود ہیں بلکہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں خداوند تعالےٰ میں موجود ہیں جو انسان کو اس کی اطاعت ورضاجوئی پر مجبور کرتی ہیں، مثلاً بیماری و دیگر مصائب سے نجات دینا وغیرہ وغیرہ تو اب ان باتوں کا لحاظ کرتے ہوئے کونسا ذی عقل ہے جو اس بات کا انکار کرے کہ خداوند تعالیٰ کی رضاجوئی انسان پر فرض نہیں ہے، وجوہ مذکورہ بالا کی طرف قرآن شریف میں متعدد جگہ توجہ دلائی گئی ہے۔

دُوسرا مقدّمہ

انسان اپنی سمجھ و عقل سے خداوند تعالیٰ کی رضا و غیر رضا ہرگز معلوم نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ خود نہ بتلائے، دلیل اس مقدمہ کی یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی رضا و غیر رضا کو بھی بغیر بتلائے ہوئے ہرگز معلوم نہیں کر سکتا حالانکہ دونوں ایک دوسرے کو نظر آتے ہیں کیونکہ دونوں جسم ہیں اور جسم تمام چیزوں سے زیادہ ظاہر ہوتا ہے بلکہ ایک دوسرے کو ہاتھ سے بھی پکڑ کر ٹٹول سکتے ہیں مگر باوجود اس کے بھی ایک دوسرے کی رضا و غیر رضا کو معلوم نہیں کر سکتا جب تک کہ دوسرا خود نہ بتلائے خواہ سینہ سے سینہ بھی ملالے بلکہ دل کو چیر کر دیکھ لے حتیٰ کہ دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دانتوں سے چبا جائے تو بھی دوسرے کے دل کی بات ہرگز معلوم نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ خود نہ بتلائے تو بھلا پھر خداوند تعالیٰ کے دل کی بات بغیر اس کے بتلائے کیونکر معلوم ہو سکتی ہے۔ حالانکہ وہ ایسا لطیف ہے کہ آج تک کسی کو دکھائی نہیں دیا اور نہ وہ ہاتھ میں آنے کی چیز ہے اور نہ انسان کو اس کے ساتھ کسی قسم کا اتحاد ہے تو پھر اس کے دل کی بات بغیر اس کے بتلائے ہوئے انسان کیونکر معلوم کر سکتا ہے چنانچہ اسی کے متعلق ارشاد ہے سورہ بقرہ کی اس آیت میں وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ (ترجمہ: اور موجودات اس کے معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لا سکتے مگر جس قدر وہ چاہے) لہٰذا اس کی رضا و غیر رضا معلوم کرنے کے لیے اس کے ارشاد کا انتظار ضروری ہوگا۔

تیسرا مقدّمہ

خداوند تعالیٰ کی شانِ عالی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے یہ نہیں ہوگا کہ وہ اپنی رضا و غیر رضا ہر شخص کو خود بتلائے اور ہر کس و ناکس سے منہ لگائے۔

دلیل اس مقدمہ کی یہ ہے کہ شاہانِ دنیا کو دیکھو کہ وہ ایک معمولی سی عظمت کی وجہ سے اپنی مرضی و غیر مرضی کی بات اپنے بنی نوع سے بھی براہِ راست نہیں کہتے، حالانکہ ہر طرح سے اتحاد ہے صرف معمولی سی عظمت حاصل ہے وہ بھی چند روزہ مستعار اس خدا کی دی ہوئی مگر اتنی سی بات پر بھی وہ اپنی رضا و غیر رضا ہر ایک کو ہرگز نہیں بتاتے پھرتے بلکہ مقربانِ بارگاہ سے فرما دیتے ہیں وہ لوگوں کو سُنا دیتے ہیں یا بذریعہ اشتہار و منادی اعلان کرا دیتے ہیں تو بھلا خداوند تعالےٰ جو تمام بادشاہوں کا بادشاہ اور بادشاہی بھی ایسی کہ جو ازلی و ابدی ہے، وہ کیا دنیا کے بادشاہوں سے بھی کم ہے کہ ہر کسی کو خود کہتا پھرے گا اور ہر کس و ناکس کو منہ لگائے گا، وہ بھی ایسا ہی کرے گا کہ اپنے مقربین درگاہ کے ذریعہ سے اپنی رضا و غیر رضا کی اطلاع دے گا اس کے متعلق ارشاد ہے سورۂ نحل کی اس آیت میں یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (ترجمہ: وہ اللہ فرشتوں کو وحی میں اپنا حکم دے کر اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں نازل فرماتے ہیں، یعنی انبیاء علیہم السلام پر۔ اور سورہ مومن کی اس آیت میں يُلْقِي الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (ترجمہ: وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے وحی یعنی اپنا حکم پہنچاتا ہے) یعنی ہر کس و ناکس کو منہ نہیں لگاتا بلکہ اپنا حکم نازل فرمانے کے لیے خاص مقربین کو منتخب فرماتا ہے۔

ان تینوں مقدموں کو سمجھ لینے کے بعد ہر ذی عقل اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ خداوند تعالےٰ بعض ہستیوں کو منصبِ قُربِ عطا فرما کر ان کے ذریعہ سے اپنی رضا و غیر رضا کا اعلان فرمائے اور جو مقربین اس منصب کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں اہلِ اسلام کی اصطلاح میں ان کو نبی اور رسول کہا جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ خداوند تعالیٰ کی رضا جوئی انسان پر فرض ہے اور انسان بغیر بتلائے خداوند تعالیٰ کی رضا و غیر رضا معلوم نہیں کر سکتا لہٰذا خداوند تعالےٰ کا بتلانا ضروری ہوا لیکن وہ ہر کس و ناکس کو براہِ راست نہیں بتائے گا اس لیے کہ یہ اس کی شان کے خلاف ہے لہٰذا اس کام کے لیے بعض مقربین و خواص کو منتخب کرنا ضروری ہوا تاکہ ان کے ذریعہ سے خداوند تعالےٰ اپنی رضا و غیر رضا کی پوری تفصیل بندوں تک پہنچا دے اور انہیں مقربین کو نبی و رسول کہا جاتا ہے۔

اس تقریر سے ثابت ہو گیا کہ انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے کی ضرورت ہے

پیغمبروں کا معصوم یعنی گناہوں سے پاک ہونا ضروری ہے

منصبِ نبوت کے لیے جو حضرات منتخب ہوں گے ان کا ظاہر و باطن میں مطیع و فرمانبردار ہونا ضروری ہے حتیٰ کہ ان سے ارادۂ معصیت بھی ممکن نہ ہو، ارتکابِ معصیت تو درکنار رہا[1]۔ کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کے بادشاہوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہے کہ جو اپنے مخالفین کو اپنے دربار میں منصبِ قرب عطا کرے بلکہ منصبِ قرب ایسے شخص کو دیا جاتا ہے کہ جس کے متعلق یقین ہو کہ یہ ظاہر و باطن میں مطیع و فرمانبردار ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ جس شخص کو منصبِ قرب دربار ربّ العزت کے لیے منتخب کیا جائے وہ خداوند تعالےٰ کا ظاہر و باطن میں ایسا مطیع و فرمانبردار ہو کہ اس سے ارادۂ مخالفت بھی ممکن نہ ہو، مخالفت کرنا تو درکنار رہا یہ بات ہرگز قرینِ قیاس نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ کسی مخالف کو اپنے دربار میں منصبِ قرب عطا فرما دے، لہٰذا نبی کا معصوم ہونا یعنی گناہوں سے پاک ہونا ضروری ہے اسی کے متعلق ارشاد ہے سورۂ انعام کی اس آیت میں اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (ترجمہ) اس موقعہ کو تو خدا ہی خوب جانتا ہے کہ جہاں اپنا پیغام (وحی کے ذریعہ سے) بھیجتا ہے) یعنی ہر کس و ناکس اس شرف کے قابل نہیں، اور جو معصوم ہستیاں اس منصب کے اہل ہیں ان کو خداوند تعالیٰ ہی جانتا ہے کسی دوسرے کو اس کا علم نہیں ہو سکتا۔

[1] تفسیر قرطبی جلد ۷ صفحہ ۳۰ [illegible] ۱۹۳

پیغمبروں کا منصبِ نبوّت سے معزول ہونا ممکن نہیں ھے

بادشاہانِ دنیا اور خداوند تعالےٰ کے انتخاب میں اتنا فرق ہے کہ بادشاہان دنیا جس کو ظاہر و باطن میں مطیع و فرمانبردار سمجھ کر منصب قرب عطا فرماتے ہیں اس میں دو طرح سے غلطی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ممکن ہے کہ وہ کسی شخص کو مطیع و فرمانبردار سمجھ کر منصبِ قرب عطا کر دیں، لیکن واقع میں وہ مطیع نہ ہو بلکہ مکّار ہو اور باطن میں بادشاہ کا سخت دشمن ہو تو اس غلطی کی وجہ سے وہ اپنے مخالف و دشمن کو منصبِ قرب عطا کر دے۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ ایک شخص واقع میں بادشاہ کا ظاہر و باطن میں مطیع و فرمانبردار ہے اور بادشاہ کا مقرب ہے لیکن بادشاہ کو اس کے متعلق بدگمانی پیدا ہو جائے تو اس غلطی کی وجہ سے وہ ایک سچے مطیع و فرمانبردار کو منصبِ قرب سے معزول کر دے۔

مگر چونکہ خداوند تعالےٰ عالم الغیب ہے اور دلوں کے راز کو بھی جانتا ہے لہٰذا نہ تو وہ مخالف و مکّار کو مطیع سمجھ کر منصبِ نبوت عطا کر سکتا ہے اور نہ کسی نبی کو بوجہ بدگمانی کے منصبِ نبوت سے معزول فرماتا ہے، اس لیے کہ خداوند تعالےٰ کا انتخاب ایسا صحیح ہوتا ہے کہ ممکن نہیں کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ ظاہر و باطن میں مطیع و فرمانبردار سمجھے اور منصبِ نبوت پر مقرر فرما دے اس سے کبھی بھی معصیت کا صدور ہو بلکہ اس سے تو ارادۂ معصیت بھی ممکن نہیں ورنہ خداوند تعالےٰ کے علم کے خلاف لازم آئیگا اور یہ ممکن نہیں ہے، لہٰذا جس شخص کو اللہ تعالیٰ منصبِ نبوت عطا فرما دے اس سے معصیت کا ہونا غیر ممکن، پس اس کا منصبِ نبوت سے معزول ہونا بھی غیر ممکن، اس لیے کہ بغیر قصور کے تو دنیا کے بادشاہ بھی معزول نہیں کرتے تو احکم الحاکمین کے متعلق یہ خیال کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ کسی مقرب کو بغیر کسی قصور کے منصبِ نبوت سے معزول کر دے۔ اس کے متعلق ارشاد ہے سورۃ الضحیٰ کی اس آیت میں والضحیٰ واللیل اذا سجیٰ ما ودّعک ربک وما قلیٰ (ترجمہ) قسم ہے دن کی روشنی کی اور رات کی جبکہ وہ قرار پکڑ لے کہ آپؐ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا ہے

اور نہ (آپؐ سے) دشمنی کی، چند دن وحی نہ آنے کی وجہ سے کفار نے یہ کہنا شروع کیا کہ ان کے رب نے ان کو چھوڑ دیا۔ اس کے جواب میں خداوند تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ آپؐ کو نبی بنانے کے بعد چھوڑ دیا جائے یعنی منصب نبوت سے معزول کر دیا جائے آپ تو آپ ہی ہیں، مراد یہ ہے کہ کسی نبی کو بھی معزول نہیں فرمایا جاتا البتہ یہ ممکن ہے کہ خدمتِ نبوت میں تخفیف کر دی جائے چنانچہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اب بالائے آسمان بحالتِ تخفیف ہیں۔

پیغمبر خود مختار نہیں ہوتے!

جیسا کہ بادشاہوں کے خواص و مقرب بارگاہ مطیع و فرمانبردار تو ہوتے ہیں لیکن شریکِ سلطنت نہیں ہوتے تاکہ خود مختار ہوں اور جس کو جو چاہیں دے دیں یا جس کو چاہیں مروا ڈالیں بلکہ بوجہ قرب صرف اتنا کر سکتے ہیں کہ کسی دوست کی سفارش کر دیں اور دشمن کی شکایت کر دیں، ایسا ہی انبیاء علیہم السلام بھی شریکِ خدائی نہیں ہوتے اس لیے ان کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ جس کو چاہیں جنت دیں اور جس کو چاہیں دوزخ میں بھیج دیں، البتہ ان کو بوجہ قرب کے یہ حق ہوتا ہے کہ کمال ادب سے کسی کی سفارش کر دیں یا کسی کی شکایت اور دوستوں کی سفارش جو انبیاء علیہم السلام در بارۂ ترقی درجات یا مغفرتِ معاصی خداوند تعالیٰ کے دربار میں قیامت کے روز کریں گے اہلِ اسلام کی اصطلاح میں اس کو شفاعت کہا جاتا ہے[1]

الحاصل انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا اور شفاعت کرنا تو عقلاً بھی صحیح ہے اور نقلاً بھی ثابت لیکن ان کا گنہگار ہونا اور خود مختار ہونا ہرگز قرینِ قیاس نہیں ہے۔ اسی کے متعلق اس آیت میں ارشاد ہے وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (سورۂ ابراہیم)

ترجمہ: ہم نے تمام (پہلے) پیغمبروں کو (بھی) ان ہی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تاکہ (ان کی زبان میں) ان سے (احکامِ الٰہیہ کو) بیان کریں پھر (بیان کرنے کے بعد) جس کو اللہ تعالیٰ

[1] شرح عقاید ص ۱۱۵، شرح المقاصد جلد ۲ ص ۲۳۹، اقتضاء الصراط المستقیم لابن تیمیہ رح ص ۱۲۴

چاہیں گمراہ کرتے ہیں اور جس کو چاہیں ہدایت کرتے ہیں اور وہی (سب امور پر) غالب ہے اور حکمت والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نبی کا کام فقط احکام کا بیان کرنا ہے اس کے بعد ہدایت و گمراہی نبی کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اس قسم کی آیتیں قرآن شریف میں اور بھی بہت ہیں اور اسی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ (میں تو صرف تقسیم کرنے والا ہوں اور دینا خدا ہے)[1]

پیغمبروں کا انسان ہونا ضروری ہے

یہ امر تو واضح ہو چکا ہے کہ جس ہستی کو منصبِ نبوت کے لیے منتخب کیا جائیگا اس کا معصوم ہونا یعنی گناہوں سے پاک ہونا ضروری ہے لیکن اس امر کی تشریح باقی ہے کہ وہ معصوم کس جنس کا ہونا چاہیے اس لیے کہ معصوم دو جنسوں کے موجود ہیں ملائکہ اور انسان ملائکہ تو سب کے سب معصوم ہیں۔ قرآن شریف میں ان کے معصوم ہونے کی تصریح ہے کہ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۝ (ترجمہ: وہ خداوند تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے بلکہ جو ان کو حکم ہوتا ہے وہی کرتے ہیں) اور انسان سب کے سب معصوم نہیں بلکہ ان میں سے بعض افراد معصوم ہوتے ہیں اور اکثر معصوم نہیں ہوتے اگر سارے معصوم ہوتے تو سلسلۂ نبوت کی ضرورت ہی نہ پڑتی اور اکثر انسانوں کا معصوم نہ ہونا اظہر من الشمس ہے، صرف معصومیت کے لحاظ سے تو ملائکہ اور انسان دونوں میں صلاحیتِ نبوت مساوی ہے۔ لیکن چونکہ سنت اللہ یہ ہے کہ اگر کسی مقصد کے حصول کے لیے متعدد راستے ہوں تو ان میں سے وہ راستہ اختیار کیا جاتا ہے جو سب سے زیادہ آسان اور فطرت کے موافق ہو۔ اس لحاظ سے نبی کا انسان ہونا ضروری ہے اس لیے کہ جن کی اصلاح کے لیے نبی کو بھیجنا ہے وہ انسان ہیں اس لیے ان کے افادہ و استفادہ کی مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ نبی انسان ہو کیونکہ فطرۃً اپنے ہم جنس سے بوجہ اتحاد کے اُنس زیادہ ہوتا ہے اس لیے افادہ و استفادہ میں

---

[1] بخاری جلد اول صا

سہولت ہوتی ہے اور خلاف جنس سے فطرۃً وحشت و نفرت ہوتی ہے اس لیے افادہ و استفادہ میں دشواری ہوتی ہے، اس مصلحت کی وجہ سے خداوند تعالےٰ نے منصبِ نبوت ہمیشہ انسان ہی کو عطا فرمایا ہے کبھی کسی فرشتہ کو اس منصب پر مقرر نہیں فرمایا اور یہ خداوند تعالےٰ کا بندوں پر بہت بڑا احسان ہے کہ ان کی اصلاح کے لیے وہ راستہ اختیار فرمایا کہ جس میں ان کو آسانی ہو اور ان کی فطرت کے موافق ہو۔ اس احسان کو اللہ تعالےٰ نے قرآن شریف میں ظاہر فرمایا ہے لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ سورۂ آل عمران (ترجمہ: حقیقت میں اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں پر (بہت بڑا) احسان کیا جبکہ ان میں انہی کی جنس سے ایک پیغمبر کو بھیجا) الحاصل انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے سے جو مقصد ہے یعنی اصلاح انسان، اس کے اعتبار سے نبی کا انسان ہونا ضروری ہے۔

پیغمبروں کے انتخاب کے بارہ میں کافروں کی رائے کا رد

کفار گو اصولاً تو مسئلہ رسالت کے منکر نہیں تھے لیکن طریقۂ انتخاب میں ان کو کلام تھا ان کی رائے یہ تھی کہ منصبِ نبوت ملائکہ کو عطا کیا جاتا، نبوت اور بشریت میں ان کے نزدیک منافات تھی وہ کہتے تھے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً سورۂ مومنون (ترجمہ: اگر اللہ تعالیٰ کو (رسول بھیجنا) منظور ہوتا تو (اس کام کے لیے) فرشتوں کو بھیجتا۔ یہ نوح علیہ السلام کی قوم کا قول نوح علیہ السلام کے مقابلہ میں، اور یہی خیال کفار عرب کا تھا اور کفار عرب ہی کے بارہ میں ہے وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا سورہ بنی اسرائیل، (ترجمہ: اور جس وقت ان لوگوں کے پاس ہدایت پہنچ چکی اس وقت ان کو ایمان لانے سے بجز اس کے اور کوئی بات مانع نہیں ہوتی کہ انہوں نے کہا کہ کیا اللہ تعالےٰ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے) یعنی ایسا نہیں ہو سکتا اگر رسول آتا تو فرشتہ آتا۔ یہ قول مشرکین عرب کا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں، غرض کفار کا عموماً یہی خیال تھا کہ انسان نبی نہیں ہو سکتا اس منصب کے لیے انتخاب ملائکہ ضروری ہے۔

کافروں کی رائے کا منشاء

کفار کے اس خیال کی وجہ یہ تھی کہ نبوت ایک بہت بڑا عظیم الشان مرتبہ ہے لہٰذا اس منصب کے لیے ایسے شخص کو منتخب کرنا چاہیے کہ جس کو اور لوگوں سے خاص طور پر امتیاز حاصل ہو تاکہ اس کو اوروں پر فوقیت ہو اس لیے کہ جب تک کسی شخص میں ایسا امتیاز نہ ہو کہ جس کی وجہ سے اوروں پر فوقیت رکھتا ہو تو اس کو کسی منصب کے لیے منتخب کرنا فیصلہ عقل کے خلاف ہے چہ جائیکہ اس کو منصبِ نبوت پر مقرر کیا جائے کہ جس سے بڑھ کر کوئی منصب ہی نہیں۔

اس خیال کو دل میں جگہ دینے کے بعد جب کفار انبیاء علیہم السلام کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے تھے تو ان کو ان میں کوئی امتیاز نظر نہیں آتا تھا کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ وہ انہی کی طرح کھاتے پیتے ہیں اور انہیں کی طرح روزی کی طلب میں بازاروں میں پھرتے ہیں، انہیں کی طرح بال بچے دار ہیں، غرض تمام لوازمِ بشریت میں مساوی ہیں کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتے، اس بناء پر وہ ان کی نبوت کا انکار کرتے تھے۔ قرآن شریف میں اس کی تصریح متعدد آیات میں ہے، نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ سورہ مومنون (ترجمہ: نوح علیہ السلام کی قوم کے رئیسوں نے عام لوگوں سے کہا کہ یہ شخص (یعنی نوح علیہ السلام) بجز اس کے کہ تمہاری طرح کا ایک (معمولی) آدمی ہے اور کچھ (رسول وغیرہ) نہیں ہے۔ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَأْكُلُ مِمَّا تَأْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ○ سورہ مومنون (ترجمہ حضرت ہود علیہ السلام یا صالح علیہ السلام کی قوم کے رئیسوں نے عام لوگوں سے کہا کہ بس یہ تو تمہاری ہی طرح ایک (معمولی) آدمی ہیں (چنانچہ) یہ وہی کھاتے ہیں جو تم کھاتے ہو اور وہی پیتے ہیں جو تم پیتے ہو) یعنی ان کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے جس کی وجہ سے ان کو منصبِ نبوت عطا کیا گیا ہو وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ۔ سورہ فرقان (ترجمہ: سرداران قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کہا کہ اس رسول کو کیا ہوا کہ وہ (ہماری طرح) کھانا کھاتا ہے اور (انتظام معاش کے واسطے ہماری طرح) بازاروں میں (بھی) چلتا پھرتا ہے) یعنی بالکل ہماری طرح بشر ہے کوئی امتیاز

اس کو حاصل نہیں ہے لہٰذا یہ نبی نہیں ہے۔ نبی تو ایسا ہونا چاہیے جو ان امور کا محتاج نہ ہونا کہ اس کو امتیاز وفوقیت حاصل ہو مطلب یہ کہ فرشتہ ہونا چاہیے کیونکہ انسان تو ان امور سے خالی ہو ہی نہیں سکتا۔ اس مضمون کی آیتیں تو بہت ہیں لیکن مقصد کی وضاحت کے لیے چونکہ مذکورہ بالا آیات بھی کافی ہیں لہٰذا انہیں پر اکتفا کرتا ہوں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نبی کے لیے خاص امتیاز ضروری ہے اور انسان ہونے کی صورت میں کوئی امتیاز نہیں پایا جاتا لہٰذا انسان کا نبی ہونا جائز نہیں ہے لیکن علاوہ انسان کے اور کسی ہستی میں بھی یہ امتیاز نہیں پایا جاتا سوا فرشتوں کے لہٰذا نبی فرشتہ ہونا چاہیے۔

کافروں کی غلط فہمی کا ازالہ

کفار کا یہ خیال کہ نبی میں اوروں کی نسبت امتیاز ہونا چاہیے تاکہ اس کو اوروں پر فوقیت ہو اصولاً صحیح ہے اور واقعی نبی اور غیر نبی میں امتیاز ضروری ہے ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی اور وہ ناجائز ہے لیکن اس کے بعد کفار کو دو طرح سے لغزش ہوئی ہے۔

پہلی لغزش یہ ہوئی کہ کفار نے یہ سمجھا کہ وہ امتیاز جسمانی امور میں ہونا چاہیے مثلاً کھانا پینا وغیرہ حالانکہ ان امور میں امتیاز کا ہونا غرضِ نبوت کے منافی ہے جس کی تفصیل دوسری لغزش کے بیان میں آئے گی، بلکہ نبی کا امتیاز تو امورِ روحانیہ میں ہوتا ہے یعنی جس قدر روحانی خرابیاں ہیں ان سب سے پاک ہونا اور جس قدر روحانی خوبیاں ہیں ان سب کا اس میں پایا جانا، یعنی تمام بد اخلاقیوں سے پاک ہونا اور تمام اخلاقِ حمیدہ کے ساتھ متصف ہونا۔ مثلاً نبی کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ زنا کاری نہیں کر سکتا۔ مکار دغاباز نہیں ہوتا، غرض کسی قسم کی معصیت و گناہ نہیں کر سکتا، جیساکہ اوپر گذر چکا ہے کہ نبی کا معصوم ہونا ضروری ہے کیا یہ امتیاز کوئی معمولی امتیاز ہے کہ اس کے علاوہ اور امتیاز کی ضرورت باقی رہے۔ کیا مکار و غیر مکار میں امتیاز نہیں، کیا جھوٹا و سچا برابر ہیں کیا زانی و غیر زانی میں امتیاز نہیں، کیا بد اخلاق و با اخلاق مساوی ہیں، کیا معصوم کو گنہگار پر امتیاز نہیں ہے بلکہ یہ امتیاز تو جسمانی امور کے امتیاز سے اعلیٰ و افضل ہے۔

اس لیے کہ جسم سے روح افضل ہے۔ لہٰذا یہ روحانی امتیاز بھی جسمانی امتیاز سے افضل واعلیٰ ہوگا۔

لیکن کفار نے امتیازِ رُوحانی کو نظر انداز کر کے فقط امتیازِ جسمانی کو دیکھا اور اس کے نظر نہ آنے سے نبوت کا انکار کر دیا۔

دوسری لغزش کفار سے یہ ہوئی کہ وہ امتیاز کے شوق میں فریفتہ ہوکر غرض نبوت کو بالکل بھول گئے یعنی یہ نہیں سوچا کہ انبیاء علیہم السلام کس غرض کے لیے بھیجے جاتے ہیں، آیا وہ غرض انسان کے نبی بنانے سے حاصل ہوتی ہے یا فرشتہ کے نبی بنانے سے اگر غرض صرف یہی ہوتی کہ انبیاء علیہم السلام کا امتیاز ظاہر کر دیا جائے تو شاید ملائکہ ہی کو منصبِ نبوت کے لیے منتخب کیا جاتا، لیکن غرض یہ نہیں ہے بلکہ غرض بنی نوعِ انسان کی اصلاح ہے جو افادہ و استفادہ کے بغیر ممکن نہیں ہے، لہٰذا انتخاب کے وقت اس بات کی رعایت ضروری ہو گی کہ افادہ واستفادہ میں سہولت کونسی صورت میں ہوسکتی ہے، یہ نہیں ہوگا کہ فقط امتیاز ہی کو گائے چلے جائیں افادہ واستفادہ حاصل ہو یا نہ ہو۔

اس غرض کو مدِنظر رکھتے ہوئے کوئی ذی عقل یہ رائے نہیں دے سکتا کہ نبی فرشتہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ افادہ واستفادہ میں جو سہولت نبی کے ہم جنس ہونے کی صورت میں ہوسکتی ہے وہ غیر جنس ہونے کی صورت میں ہرگز نہیں ہوسکتی خصوصاً غیر جنس بھی فرشتہ۔

فرشتہ سے تو افادہ واستفادہ قریب قریب ناممکن ہے قرآن شریف میں اس بات کو واضح کر دیا گیا ہے کہ نبی کے فرشتہ ہونے کی صورت میں افادہ و استفادہ ممکن نہیں ہے۔ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝ سورۃ انعام (ترجمہ) اور اگر ہم رسول کوئی فرشتہ تجویز کرتے تو البتہ ہم اس کو آدمی ہی کی صورت میں بناتے، اور ہمارے اس فعل سے ان پر وہی اشکال ہوتا جو اب

اشکال کر رہے ہیں، آیت کا حاصل یہ ہے کہ اگر فرشتہ کو نبی بنایا جاتا تو اس کی دو صورتیں تھیں ایک یہ کہ اس کو اپنی اصلی شکل میں بھیجا جائے، دوسری یہ کہ اس کو انسان کی شکل میں بھیجا جائے جیسا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت دحیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکل میں آیا کرتے تھے۔ اوّل صورت تو ممکن ہی نہیں اس لیے کہ عام لوگ ان حواس متعارفہ کے ساتھ فرشتہ کو اس کی اصلی صورت میں دیکھنے پر قادر نہیں ہیں، دیکھتے ہی خوف کے مارے مر جائیں یا بے ہوش ہو کر گر جائیں۔ عام لوگ تو درکنار رہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ذی حوصلہ اور بہادر (جن سے بڑھ کر آج تک کوئی بہادر دنیا میں پیدا نہیں ہوا اور نہ قیامت تک ہوگا) بھی فرشتوں کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کو بآسانی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی وجہ سے جبرائیل علیہ السلام آپ کے پاس عموماً انسانی شکل میں آیا کرتے تھے تمام عمر میں آپ کو صرف دو مرتبہ جبرائیل علیہ السلام کی اصلی شکل دکھائی گئی وہ بھی ایک مصلحت کی وجہ سے جس کا بیان آگے آئے گا۔

غرض جس نبی کو دیکھتے ہی جان چلی جائے یا چلے جانے کا گمان غالب ہو اس نبی سے افادہ و استفادہ (جو نبوت کی اصلی غرض ہے) کیونکر ممکن ہو سکتا ہے، البتہ اگر نبی کے بھیجنے کی غرض یہ ہوتی کہ لوگوں کو یکدم ہلاک کر دیا جائے تو بیشک یہ غرض فرشتہ کو اس کی اصلی شکل میں بھیجنے ہی سے حاصل ہو سکتی تھی لیکن جب غرض ہلاک کرنا نہیں ہے بلکہ غرض تو اصلاح بنی نوع انسان ہے جو افادہ و استفادہ پر موقوف ہے تو کوئی عاقل نہیں کہہ سکتا کہ یہ غرض فرشتہ کو اس کی اصلی شکل میں بھیجنے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

الغرض یہ امر واضح ہو گیا کہ فرشتہ کو اس کی اصلی شکل میں نبی بنا کر بھیجنا غرض نبوت کے بالکل خلاف ہے اور یہی مطلب ہے (وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا) کا

دوسری صورت (یعنی فرشتہ کو انسان کی شکل میں بھیجا جائے) بھی مفید نہیں اس لیے کہ اس صورت میں کفار وہی اعتراض کریں گے جو اب کر رہے ہیں یعنی یہ کہیں گے کہ

بنی انسان کیوں ہے فرشتہ کیوں نہیں ہے، کیونکہ اس کو انسانی شکل میں دیکھنے کے بعد یقین نہیں کریں گے کہ یہ فرشتہ ہے اگر وہ کہے گا بھی کہ میں فرشتہ ہوں تو ہرگز باور نہیں کریں گے بلکہ یہی سمجھیں گے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے یہ تو آدمی ہی ہے اور آدمی نبی نہیں ہوسکتا لہٰذا یہ نبی نہیں ہے اور یہی مطلب ہے وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ کا۔

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ فرشتہ کو نبی بنانے کی دونوں صورتوں میں نفع تو کچھ بھی نہیں ہے بلکہ بجائے نفع کے اُلٹا ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے لہٰذا یہ رائے حماقت پر مبنی ہے حکیم علی الاطلاق کی شان سے بعید ہے کہ وہ ایسا کرے۔

اعتراض

اگر کہا جائے کہ فرشتہ کو بشکل آدمی بھیجنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ شکلِ انسانی کے ساتھ ساتھ خواص انسانی بھی اس میں رکھے جائیں مثلاً کھانا کھانا وغیرہ، دوسری یہ کہ فقط شکلِ انسانی دی جائے خواص ملائکہ ہی کے باقی رہیں جیسا کہ جبرائیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے بصورت حضرت دحیہ رضی اللہ عنہ کے، مگر خواصِ ملکیّت باقی رہتے تھے، یا جیسا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے پاس چند ملائکہ بیٹے کی بشارت اور قوم لوط کی ہلاکت کی خبر سُنانے کے لیے بشکلِ انسان آئے تھے مگر خواص ملائکہ ان میں موجود تھے اسی وجہ سے جب حضرت ابراہیم خلیل اللہ بچھڑے کا گوشت ان کے پاس لائے تو انہوں نے اس کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھائے۔ کھانا تو درکنار رہا

ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت میں تو واقعی اشتباہ ہوسکتا ہے کہ یہ انسان ہے فرشتہ نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں کوئی وجہ امتیاز باقی نہیں ہے جس کی وجہ سے معلوم ہو سکے کہ یہ فرشتہ ہے، لیکن دوسری صورت میں چونکہ خواص ملکیت باقی ہیں لہٰذا یہ اشتباہ نہیں ہوسکتا کہ یہ آدمی ہے، پس اگر یہ صورت اختیار کی جائے تو اس

میں کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ غرض نبوت بھی اس صورت میں آسانی سے حاصل ہو سکتی ہے کیونکہ بوجہ صورتِ انسانی کے وحشت و نفرت نہیں ہو گی تاکہ افادہ و استفادہ میں دشواری ہو اور یہ اشتباہ بھی نہیں ہو گا کہ یہ فرشتہ نہیں ہے پھر اس صورت کو کیوں نہیں اختیار کیا گیا اس اعتراض کے متعدد جواب ہیں۔

پہلا جواب یہ ہے کہ اشتباہ کی صورت تو یہی ہے کہ شکل انسان کی ہو اور خواص ملائکہ ہوں اور یہی مراد ہے (وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ) میں۔ کیونکہ جس صورت میں شکل و خواص دونوں انسان کے ہوں اس صورت میں تو اشتباہ کی گنجائش ہی نہیں ہے بلکہ اس صورت میں تو نبی یقیناً انسان ہے، فرشتہ نہیں ہے خواہ ابتداء ہی سے انسان ہو یا خداوند تعالٰی نے اپنی قدرتِ کاملہ سے فرشتہ کو انسان بنا دیا ہو، بہرکیف اشتباہ کا اطلاق اس صورت پر سراسر نادانی ہے۔ اشتباہ تو صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ شکل تو انسان کی ہو اور خواص ملائکہ ہوں، کیونکہ شکل کو دیکھتے ہی خیال آئے گا کہ یہ انسان ہے فرشتہ نہیں ہے، اور خواص کی اوّل تو تحقیق ہی کیوں کرنے بیٹھے گا اور اگر بالفرض تحقیق کے بعد معلوم بھی ہو جائے کہ اس نبی میں خواص ملائکہ نہیں تو پھر بھی یقین نہیں آئے گا کہ یہ فرشتہ ہے کیونکہ جس خدا کو یہ قدرت ہے کہ فرشتہ کی شکل کو انسانی شکل سے بدل دے اس کو یہ بھی قدرت ہے کہ انسانی خواص کو خواص ملائکہ سے بدل دے تو ان دونوں احتمالوں کے ہوتے ہوئے کیونکر یقین آ سکتا ہے کہ یہ فرشتہ ہے بصورتِ انسان یا انسان ہے بخواص فرشتہ، لہٰذا یہ کہنے کی گنجائش ہو گی کہ یہ فرشتہ نہیں ہے۔ بلکہ انسان ہے خصوصاً وہ کفار جو اتباع کا ارادہ ہی نہیں رکھتے خواہ مخواہ بہانے بنا کر ٹالنا ہی چاہتے ہیں ان کے لیے تو معمولی سا بہانہ بھی کافی ہو سکتا ہے اور یہاں تو معمولی بھی نہیں ہے بلکہ صاف طور پر انسان کی شکل موجود ہے، بہانہ ساز تو دیکھتے ہی کہہ دے گا کہ یہ انسان ہے فرشتہ نہیں ہے لہٰذا یہ نبی نہیں ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں غرض نبوت بھی پوری نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے پورا ہونے میں دو طرح کے مانع پیش آتے ہیں۔

ایک مانع یہ ہے کہ جب فرشتہ کی فقط شکل ہی تبدیل ہوگی خاصیت باقی رہے گی تو اس صورت میں گو وہ خوف جو اس کی اصلی شکل سے پیدا ہوتا تھا جاتا رہے گا لیکن وہ اُنس جو فطرۃً ہم جنس سے پیدا ہوتا ہے وہ نہیں پیدا ہوگا۔ بلکہ وہ وحشت و نفرت جو فطرۃً خلافِ جنس سے ہوا کرتی ہے بدستور باقی رہے گی کیونکہ صرف شکل کی تبدیلی سے اتحادِ جنس پیدا نہیں ہوتا اس وجہ سے افادہ و استفادہ میں روک پیدا ہوگی۔

دوسرا مانع یہ ہے کہ جب نبی میں خواص انسانی نہیں ہوں گے تو وہ انسانوں کی اصلاح نہیں کر سکے گا۔ بھلا جس نے خود کبھی کھانا نہ کھایا ہو اور نہ قیامت تک کھا سکتا ہو وہ دوسروں کو کھانا کھانے کا طریقہ کیا بتائے گا اور جس کو قیامت تک پیشاب و پاخانہ نہ آسکتا ہو وہ دوسروں کو پیشاب و پاخانہ کے متعلق کیا تعلیم دے سکتا ہے اور جو تمام عمر شادی نہ کر سکتا ہو وہ اوروں کو خانہ داری کے معاملات کیا سکھلائے گا۔ اور جو بیمار ہونے کے معنے ہی نہ جانتا ہو وہ دوسروں کے مرض کا کیا علاج کر سکتا ہے اور جس نے تجارت کی صورت بھی نہ دیکھی ہو وہ اوروں کو تجارت کیا سکھلائے گا۔ علیٰ ہٰذا القیاس باقی امور، اور ملائکہ کا ان تمام باتوں سے منزّہ ہونا محتاجِ بیان نہیں ہے۔

پس اگر کسی فرشتہ کو نبی بنایا جائے تو وہ ان امور کی اصلاح نہیں کر سکے گا البتہ جن امور کو وہ خود کر کے دکھا سکتا ہے ان کی اصلاح کر دے گا۔ مثلاً نماز روزہ وغیرہ مگر اس قسم کے امور کم ہیں اور جن کو وہ خود نہیں کر سکتا وہ زیادہ ہیں کیونکہ تمام خواہشاتِ انسانی کی اصلاح کرنی ہے اور فرشتہ ان سے منزّہ ہے وہ تمام باتوں کو کر کے نہیں دکھا سکتا، زیادہ سے زیادہ کچھ نہ کچھ زبانی بتا دے گا لیکن صرف زبانی

تعلیم میں دو قسم کی کمزوری ہوتی ہے ۔

پہلی کمزوری یہ کہ لوگوں پر اثر بہت کم ہوتا ہے کیونکہ لوگوں کے دلوں میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں تو کہے چلا جاتا ہے کہ کرو اور خود نہیں کرتا ، ہم کیوں کریں اور جب زبانی تعلیم کے ساتھ عمل بھی رل جاتا ہے تو وہ زوردار ہوجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم زیادہ مؤثر ہوتی ہے کیونکہ وہ جو کچھ زبان مبارک سے فرماتے ہیں سب سے پہلے خود کرکے بھی دکھاتے ہیں اور ہم زبانی تو بہت کچھ کہہ دیتے ہیں مگر عمل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں ، لہٰذا ہماری تعلیم کا اثر بھی بہت کم ہوتا ہے ۔ مقامِ حدیبیہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کو تین دفعہ ہدی کے جانوروں کو نحر کرنے کا حکم دیا مگر ڈیڑھ ہزار آدمیوں میں سے ایک بھی نہیں اٹھا اور جب آپ نے اپنی ہدی کو اپنے ہاتھ مبارک سے نحر کیا تو تمام صحابہ کرام نے بڑی سرعت کے ساتھ اس حکم کی تعمیل کی ۔

دوسری کمزوری یہ کہ جب صرف سُنی ہوئی بات کو عمل میں لایا جاتا ہے تو بہت سی غلطیاں واقع ہوجاتی ہیں کیونکہ جب تک معلم زبانی بتائی ہوئی بات کو خود کرکے نہ دکھائے اس کو صحیح طور پر عمل میں لانا ممکن نہیں ہوتا ۔ مثلاً اگر کوئی شخص فنِ طب کی تمام کتابیں پڑھ لے مگر استاد کے سامنے مَطب نہ کرے تو وہ ہرگز کسی مرض کا صحیح طور پر علاج نہیں کرسکتا ۔

پس اگر نبی فرشتہ ہوتا تو ان امور کی اصلاح بالکل ناقص رہتی جن کو وہ خود نہیں کرسکتا اور زیادہ امور ایسے ہی ہیں کہ جن کو وہ خود نہیں کرسکتا جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ۔ الحاصل نبی کے فرشتہ ہونے کی صورت میں غرض نبوت کی تکمیل نہیں ہوسکتی اور دین ناقص رہ جاتا ہے مکمل اصلاح جب ہی ہوسکتی ہے کہ نبی میں بھی تمام خواص انسانی موجود ہوں تاکہ علاوہ زبانی تعلیم کے عملی نمونہ بھی دکھا سکے اور یہ بات

فرشتہ میں ممکن نہیں ہے لہٰذا اس کا نبی ہونا بھی خلافِ مصلحت ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ اگر فرشتہ کو بصورتِ انسان نبی بنا کر بھیجا جائے اور خواص ملکیت اس میں باقی ہوں تو اس صورت میں یہ اندیشہ ہے کہ لوگ اس کو خدا بنا کر پوجنے لگیں اس لیے کہ جب اس میں صفاتِ خداوندی (یعنی کھانے پینے وغیرہ سے پاک ہونا) دیکھیں گے تو اس غلطی میں ضرور مبتلا ہوں گے جیسا کہ نصاریٰ نے جب عیسیٰ علیہ السلام میں بعض صفاتِ خداوندی (یعنی مُردوں کو زندہ کرنا وغیرہ) کو دیکھا تو ان کو خدا بنا لیا اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لَا تطروني كما أطرت النصارىٰ عيسى ابن مريم فَاِنَّمَا اَنَا عَبْدُهٗ وَرَسُولُهٗ ولكن قولوا عبد الله ورسولهٗ" بخاری باب قول اللہ عزوجل واذکر فی الکتاب مریم الخ (ترجمہ: میری تعریف میں بیجا مبالغہ نہ کرنا جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متعلق کیا کیونکہ میں تو فقط خدا کا بندہ ہوں ولیکن میرے بارہ میں یہ کہنا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں یعنی نصاریٰ کی طرح مجھے معبود نہ بنانا۔

ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد آفتاب کی طرح واضح ہوجاتا ہے کہ منصبِ نبوت کے لیے انسان ہی کو منتخب کرنا ضروری و لازم ہے، انتخابِ ملائکہ بالکل مصلحت کے خلاف ہے اور کفار کی رائے جو ملائکہ کے متعلق تھی وہ محض نادانی پر مبنی تھی۔

اس تقریر کے بعد یہ بھی واضح ہوگیا کہ جن باتوں کو کفار نبوت کے خلاف سمجھ کر بصورتِ اعتراض پیش کرتے تھے وہ سب کی سب نبوت کے موافق بلکہ غرضِ نبوت کی تکمیل کے لیے ضروری و لازم ہو جائیں گی، مثلاً نبی کا کھانا پینا طلب معاش کے لیے بازاروں میں چلنا پھرنا، نکاح کرنا وغیرہ، کفار ان تمام باتوں کو نبوّت کے خلاف سمجھتے تھے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، مگر تقریر سابق کے سمجھنے کے بعد واضح ہوگیا کہ نبی لوگوں کی اصلاح کر ہی نہیں سکتا جب تک کہ کھانا پینا وغیرہ تمام لوازمِ بشریّت اس میں نہ ہوں بلکہ الٹا اندیشہ

ہونا ہے کہ لوگ اس کو کہیں خدا نہ بنالیں، اس مصلحت کی طرف قرآن شریف میں متعدد جگہ توجہ دلائی گئی ہے اور کفار کی غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند آیتیں نقل کرتا ہوں وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِیْنَ ۝ سورہ انبیاء (ترجمہ: اور ہم نے ان رسولوں کے (جو آپ سے پہلے تھے) ایسے جسم نہیں بنائے تھے جو کھانا نہ کھاتے ہوں اور وہ حضرات ہمیشہ رہنے والے نہیں ہوئے) مطلب یہ ہے کہ وہ فرشتے نہ تھے کہ نہ کھانا کھاتے اور نہ مرتے بلکہ انسان تھے تمام خواص انسانی ان میں موجود تھے)

وَمَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمْ لَیَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَیَمْشُوْنَ فِی الْاَسْوَاقِ۔ (سورہ فرقان) ترجمہ: اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے یعنی نبوت اور کھانا کھانے وغیرہ میں منافات نہیں ہے جیسا کہ کفار کا خیال ہے بلکہ ان امور کا ہونا نبی کے لیے ضروری ہے۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّیَّةً۔ سورہ رعد، (ترجمہ: اور ہم نے یقیناً آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بیبیاں اور بچے بھی دیے) یعنی بیبیوں اور بچوں کا ہونا نبوت کے منافی نہیں بلکہ رسولوں میں ان امور کا ہونا ضروری ہے بغیر اس کے اصلاح مکمل نہیں ہوسکتی اور دین ناقص رہتا ہے۔

الحاصل سہولت افادہ و استفادہ اور تکمیلِ اصلاح دونوں کا تقاضا یہی ہے کہ نبی انسان ہونا چاہیے فرشتہ ہونے کی صورت میں افادہ و استفادہ بھی آسانی سے نہیں ہوسکتا اور لوگوں کی اصلاح بھی کامل طور پر نہیں ہوسکتی۔

پیغمبروں کے لیے معجزات کی ضرورت

اگر فرشتہ نبی ہوتا تو شاید معجزات کی ضرورت نہ پڑتی کیونکہ صداقت میں لوگوں کو شک نہ ہوتا، تاکہ معجزات کی ضرورت ہوتی لیکن فرشتہ کا نبی ہونا مصلحت کے خلاف ہے

بلکہ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہی نبی بنایا جائے جس کی تشریح اوپر گذر چکی ہے اور اس صورت میں یہ بھی احتمال ہے کہ کوئی جھوٹا آدمی دعوٰی نبوت کر دے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ کوئی ایسی بات ہونی چاہیے کہ جس کی وجہ سے جھوٹے اور سچے میں تمیز ہو سکے اور نبی صادق اپنی صداقت قوم کے سامنے ظاہر کر سکے تاکہ قوم اس کی طرف متوجہ ہو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے معجزات تجویز کیے گئے ہیں۔

الحاصل معجزات نبوت سے خارج ہیں نبوت ان پر موقوف نہیں ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ اوّل معجزات میں امتحان ہو جو معجزات دکھا دے اس کو نبوت عطا کی جائے جو معجزات نہ دکھائے اس کو نبوت نہ ملے، بلکہ نبوت پہلے دے دی جاتی ہے اس کے بعد لوگوں کے سامنے اس نبوت کا اظہار کرنے کے لیے معجزات دیئے جاتے ہیں، لہٰذا وہ حقیقتِ نبوت سے خارج ہوتے ہیں بلکہ عموماً لوازمِ نبوت میں سے ہوتے ہیں، اگر قوم بغیر معجزہ دکھانے کے ایمان لے آئے تو معجزہ دکھانے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، مگر چونکہ ایسا اتفاق بہت کم ہوتا ہے بلکہ معجزہ دکھانے کے بعد بھی قوم کا ایمان لانا غنیمت ہوتا ہے لہٰذا معجزات کا دینا عموماً نبوت کے ساتھ لازم ہوتا ہے۔

معجزات کی حقیقت

معجزہ عربی لفظ ہے جس کا مصدر اعجاز ہے، اعجاز کے معنے عاجز کر دینے اور ہرا دینے کے ہیں، یعنی نبی ایک ایسا کام کر کے دکھاتا ہے کہ اور لوگ سب کے سب اس کام کے کرنے سے عاجز آجاتے ہیں اور اس کام میں نبی کا مقابلہ کرنے میں ہار جاتے ہیں اور معجزہ حقیقت میں نبی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ فعلِ خدا ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ لوگ اس کو دعوٰی نبوت میں سچا سمجھ کر ایمان لائیں کیونکہ جب لوگ ایک شخص کے ہاتھ سے ایسا کام ہوتا ہوا دیکھ لیتے ہیں جو ان سے نہیں ہو سکتا تو وہ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ کام انسانی طاقت سے نہیں ہوا بلکہ خدائی طاقت سے ہوا ہے ورنہ

ہم بھی کر لیتے اور خدائی طاقت جھوٹے کا ساتھ نہیں دے سکتی لہٰذا یہ پایا ہے۔

قرآن شریف میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ معجزہ حقیقت میں فعلِ خدا ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر کیا جاتا ہے وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی، جنگ بدر میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مٹھی کنکریوں کی اٹھا کر کافروں کی طرف پھینکی جس کے ریزے سب کی آنکھوں میں جا کر گرے اور ان کو شکست ہوئی، ایک مٹھی کا تمام لشکر کی آنکھوں میں پڑنا یہ ایک معجزہ تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر نمایاں ہوا تھا۔ اس کے متعلق باری تعالیٰ اس آیت میں فرماتے ہیں کہ اے نبی وہ مٹھی خاک آپ نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی۔

الحاصل معجزہ حقیقت میں فعلِ خدا ہوتا ہے جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر کیا جاتا ہے مگر جو لوگ اس حقیقت سے صحیح طور پر واقف نہیں ہیں وہ بہت بڑی گمراہی میں واقع ہو جاتے ہیں وہ اس فعل کو نبی کا اپنا فعل سمجھ کر اس کو خدا بنا لیتے ہیں، جیسا کہ نصاریٰ نے جب عیسیٰ علیہ السلام کو مُردے زندہ کرتے دیکھا تو ان کو خدا بنا لیا، اگر وہ معجزہ کی صحیح حقیقت سے واقف ہوتے تو اس غلط فہمی میں نہ واقع ہوتے بلکہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا سچا نبی سمجھتے۔

پیغمبروں کا معجزات میں مختلف ہونے کا سبب

تمام انبیاء علیہم السلام کو مختلف معجزے دیئے گئے ہیں، ایسا نہیں کیا گیا کہ سب کو ایک ہی طرح کے معجزے دیئے جاتے مثلاً جو معجزے عیسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے ہیں یعنی مردے زندہ کرنا وغیرہ سب کو یہی دیئے جاتے یا سب کو عصا و ید بیضا ہی دیا جاتا جو موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا تھا۔ علیٰ ہٰذا القیاس باقی معجزات، مگر ایسا نہیں کیا گیا بلکہ ہر ایک نبی کو علیحدہ علیحدہ معجزے دیئے گئے ہیں۔

جیسا کہ معجزہ کی حقیقت سے صحیح طور پر آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے نصاریٰ کو غلط فہمی

ہوئی کہ عیسٰی علیہ السلام کو خدا بنا لیا، ایسا ہی اختلاف معجزات کی صحیح وجہ نہ معلوم کے سبب سے اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے اور طرح طرح کے اعتراض پیش آئے ہیں، کسی نے تو یہ اعتراض کیا (لَوْ لَا اُوْتِیَ مِثْلَ مَا اُوْتِیَ مُوْسٰی) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ معجزات کیوں نہیں دیئے گئے جو موسٰی علیہ السلام کو دیئے گئے تھے یعنی عصا و ید بیضا اور کسی نے ایک نبی کے معجزات کا دوسرے نبی کے معجزات سے مقابلہ کرنا شروع کیا اور یہ نتیجہ نکالا کہ جس نبی کے معجزے بڑے ہیں وہ نبی بھی بڑا ہے، مثلاً نصارٰی یہ کہتے ہیں کہ ہمارے نبی کے معجزات تمہارے نبی کے معجزات سے بڑے ہیں لہٰذا ہمارے نبی (یعنی عیسٰی علیہ السلام) تمہارے نبی (یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم) سے افضل ہیں۔

ان غلط فہمیوں کو دیکھتے ہوئے ضروری معلوم ہوا کہ اختلاف معجزات کی صحیح وجہ بیان کر دی جائے تا کہ یہ غلط فہمیاں دُور ہو جائیں۔

انبیاء علیہم السلام کے معجزات دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک قسم وہ معجزات جو بغرض تحدی عطا کیے جاتے ہیں یعنی اس غرض کے لیے کہ نبی جن لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے ان معجزات کو ان کے مقابلہ میں پیش کر کے ان کو عاجز کر دے اور ہرا دے تا کہ اس کی صداقت ان لوگوں پر واضح ہو جائے۔ اور دوسری قسم وہ معجزات ہیں جو بغرض تحدی نہیں دیئے جاتے یعنی ان کا ظاہر کرنا بغرضِ مقابلہ و اظہارِ صداقت نہیں ہوتا۔ اگرچہ ظاہر کرنے کے بعد صداقت کی بھی تائید ہو جاتی ہے۔

تشریح معجزات قسم اوّل

معجزہ اگرچہ نبوت کی حقیقت سے خارج ہے کیونکہ نبوت کا ملنا اظہارِ معجزہ پر موقوف نہیں ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، لیکن اظہارِ صداقت کے لیے چونکہ نبی کو معجزہ کی ضرورت پڑتی ہے اس بنا پر خداوند تعالٰے کی طرف سے انبیاء علیہم السلام کو

اپنے اپنے زمانہ میں حسب ضرورت خاص خاص معجزے عطا ہوتے رہے تاکہ قوم کے سامنے صداقت کا اظہار کر سکیں خصوصًا وہ حضرات انبیاء جو نئی شریعت لے کر دنیا میں آتے ہیں ان کو معجزات کی ضرورت بہ نسبت دیگر حضرات کے زیادہ اشد ہوتی ہے کیونکہ وہ ایک بہت بڑا انقلاب لانے کے لیے آتے ہیں لوگ ان کی مخالفت زیادہ زور سے کرتے ہیں اس لیے کہ لوگوں کے دلوں میں پہلی شریعت کی وقعت و عظمت اس قدر ہوتی ہے کہ وہ اس کو چھوڑ کر دوسری شریعت کو قبول کرنا ہرگز گوارا نہیں کرتے اس وجہ سے کہ انسان کو مذہب سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں ہوتی خواہ اس کا مذہب نفس الامر میں باطل ہی کیوں نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ انسان مذہبی امور میں کسی بڑے سے بڑے حاکم سے اپنے برخلاف سُن کر سر تسلیم خم کر سکتا ہے۔ مگر مذہب کے متعلق کسی بڑے سے بڑے حاکم کے فیصلہ کو بھی قبول نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب سلطنت مذہبی امور میں دخل نہیں دیتے وہ سمجھتے ہیں کہ سلطنت میں فساد برپا ہو جائے گا، لوگ لڑتے مرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے مگر مذہب کے خلاف فیصلہ نہیں مانیں گے، لہٰذا جو انبیاء علیہم السلام نئی شریعت لے کر آتے ہیں اور لوگوں سے پہلی شریعت کے بجائے اپنی شریعت منوانا چاہتے ہیں تو لوگ ان کا مقابلہ زیادہ زور سے کرتے ہیں لہٰذا ان حضرات کو اس بات کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ ان کو ایسے زبردست معجزے دیئے جائیں کہ لوگ ان کے مقابلہ سے عاجز آ کر سر تسلیم خم کر دیں اگرچہ معاندین تو پھر بھی نہیں مانیں گے لیکن منصف مزاج تو ضرور ہی مان جائیں گے۔

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے موسیٰ علیہ السلام کو عصا و ید بیضا عطا کیا گیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو اِحیاءِ موتیٰ و ابراء اکمہ و ابرص و خلق طیر یعنی مردوں کو زندہ کرنا اور مادر زاد اندھوں کو اور برص کے بیماروں کو اچھا کرنا اور گارے یعنی مٹی کے جانور بنا کر اڑانا وغیرہ عطا کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اعجازِ قرآن دیا گیا یعنی ایسی

کتاب عطا فرمائی کہ جس میں وصفِ اعجاز رکھ دیا جس کی تشریح عنقریب آئے گی۔

باقی رہی یہ بات کہ تمام حضرات کو ایک قسم کے معجزات کیوں نہیں دیئے گئے، اور اگر مختلف معجزات ہی دینے منظور تھے تو صورت موجودہ ہی کو کیوں اختیار کیا گیا ایسا کیوں نہیں کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو احیاءِ موتیٰ وغیرہ اور عیسیٰ علیہ السلام کو قرآن شریف دیا جاتا علیٰ ہذا القیاس باقی احتمالات، تو اس کے سمجھنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ پہلے معجزاتِ تحدی کے دینے کا قاعدہ کلیہ بیان کر دیا جائے تاکہ اختلافِ معجزات کی وجہ آسانی سے سمجھ میں آجائے۔

تحدی کے معجزات کا قاعدہ

جو معجزات تحدی اور مقابلہ کی غرض سے دیئے جاتے ہیں ان کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس فن میں دیئے جائیں جس فن میں اس قوم کو جس سے تحدی اور مقابلہ ہے، اعلیٰ درجہ کی مہارت ہو بلکہ اس فن میں اس قوم کا دنیا بھر میں ثانی نہ ہو، اس لیے کہ اس کے بغیر قوم کو معجزہ کا معجزہ ہونا سمجھ میں نہیں آسکتا اور قوم ہی کو سمجھانا منظور ہے، مثلاً اگر کوئی شخص فن پہلوانی میں ماہر ہو ایک ایسی قوم کے پاس جا کر دعوائے نبوت کر دے جو فن پہلوانی سے تو بالکل ناواقف ہو مگر فن سنگ تراشی میں لے مثل زمانہ ہو اور معجزہ یہ پیش کرے کہ تم میرے ساتھ کشتی کر کے دیکھو اگر میں غالب آجاؤں تو سمجھ لینا کہ میں سچا ہوں، تو کیا وہ قوم اس شخص کے کشتی میں غالب آنے کو معجزہ تسلیم کر لے گی؟ ہرگز نہیں، اس لیے کہ ایک ماہرِ فن کا فن کے نہ جاننے والے پر غالب آنا نہ تو کوئی کمال کی بات ہے اور نہ خلافِ عادت ہے، بلکہ مقتضائے عادت یہی ہے کہ ماہرِ فن ناواقف پر غالب آئے اور معجزہ ہمیشہ خلافِ عادت ہوتا ہے یعنی کسی شخص کے ہاتھ سے ایسے فعل کا ظاہر ہونا جو عادۃً انسانی طاقت سے باہر ہو۔

البتہ اگر وہ پہلوان یہ کہے کہ میں تو فن سنگ تراشی سے بالکل ناآشنا ہوں اور تم

اس فن میں یکتائے زمانہ ہو مگر باوجود اس کے میں تم کو سنگ تراشی میں ہرادوں گا، تو بے شک یہ معجزہ ہوگا، اور قوم بھی اس کو معجزہ سمجھے گی کیونکہ ناواقف کا ماہر فن پر غالب آنا قطعاً عادت کے خلاف ہے تو اس صورت میں یقیناً یہ کہا جائے گا کہ یہ شخص انسانی طاقت سے غالب نہیں آیا بلکہ آسمانی طاقت سے غالب آیا ہے لہٰذا اپنے دعوٰی نبوت میں سچا ہے، یا مثلاً ایک شخص اعلیٰ درجہ کا طبیب ایک ایسی قوم کے پاس جاکر دعوٰی نبوت کرے جو فن طِب سے تو بالکل ناآشنا ہو مگر زبان انگریزی میں ماہر بلکہ لاثانی ہو اور معجزہ یہ پیش کرے کہ میں فن طب میں تم سب کو ہرا سکتا ہوں تو کیا یہ قوم اس کے فن طب میں غالب آنے کو معجزہ تسلیم کرلے گی، ہرگز نہیں، کیونکہ طب جاننے والے کا نہ جاننے والے پر غالب آنا کوئی کمال کی بات نہیں ہے اور نہ خلافِ عادت ہے۔ بلکہ مقتضائے عادت کے موافق ہے، لیکن اگر وہ شخص یوں کہے کہ میں تو انگریزی سے ناواقف ہوں اور تم یکتائے زمانہ ہو مگر باوجود اس کے میں تم پر انگریزی دانی میں غالب آسکتا ہوں اور غالب آکر دکھا دے تو بے شک یہ فعل عادت کے خلاف ہے وہ قوم اس کو معجزہ تسلیم کرے گی بشرطیکہ عناد سے کام نہ لے۔

الحاصل تحدّی کے لیے معجزہ کا اسی فن میں ہونا ضروری ہے جس فن میں قوم کو کمال حاصل ہو ورنہ معجزہ قوم کے نزدیک معجزہ نہیں بن سکتا۔

اس قاعدہ کے سمجھ لینے کے بعد نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو معجزات تحدّی مختلف کیوں دیئے گئے اور اختلاف کی صورت موجودہ کیوں اختیار کی گئی، اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام جس قوم کی طرف بھیجے گئے تھے یعنی قوم فرعون چونکہ اس قوم کو فن جادوگری وشعبدہ بازی میں کمال تھا اور اس فن کے جاننے والے اس کثرت سے تھے کہ بقول بعض مفسرین فرعون نے ستر ہزار جادوگر موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لیے جمع کیے تھے بلکہ بعض نے اسّی ہزار بھی لکھے ہیں اور ان کو اس فن میں اسقدر غرور تھا

کہ نہایت ہی دلیری سے کہنے لگے وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ہ کہ فرعون کی عزت کی قسم بے شک ہم ہی غالب آئیں گے، لہٰذا قاعدہ مذکورہ کے اعتبار سے یہی مناسب تھا کہ موسٰی علیہ السلام کو معجزہ بھی اسی رنگ میں دیا جاتا تاکہ اگر وہ جادو کے ذریعہ سے سانپ بنا کر دکھائیں تو یہ معجزہ کے ذریعہ سے ایسا سانپ بنا کر پیش کریں کہ تمام جادوگروں کو ہرا دیں تاکہ وہ سمجھ جائیں کہ یہ شخص باوجود فن جادوگری سے ناآشنا ہونے کے ہم پر غالب آگیا ہے، حالانکہ ہم اس فن میں یکتائے زمانہ تھے، یہ ضرور سچا نبی ہے، ورنہ اس فن میں ہم پر کبھی غالب نہ آسکتا، تفسیر خازن[1] میں ہے کہ مقابلہ سے پہلے ایک دن موسٰی علیہ السلام نے جادوگروں کے امیر سے فرمایا کہ اگر میں غالب آجاؤں تو تو مجھ پر ایمان لے آئے گا اور اس بات کی شہادت دے گا کہ جو کچھ میں لایا ہوں وہ حق ہے تو اس نے جواب میں کہا کہ کل میں ایسا جادو لاؤں گا کہ کوئی جادو اس پر غالب نہیں آسکے گا۔ اگر آپ ہم پر غالب آئینگے تو میں ضرور ایمان لے آؤں گا اور اس بات کی شہادت دوں گا کہ جو کچھ آپ لائے ہیں وہ حق ہے جادو نہیں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ تمام جادوگروں نے میدانِ مقابلہ ہی میں سربسجود ہو کر بھرے مجمع میں (اٰمَنَّا بِرَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ) کا نعرہ بلند کیا اور ایمان سے مشرف ہوئے[1]۔

اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کے زمانہ میں لوگوں کو فنِ طب میں کمال تھا اور اس فن میں وہ لاثانی تھے، چنانچہ بڑے بڑے ماہر فن طب اسی زمانہ میں گزرے ہیں، چنانچہ قاعدہ مذکورہ کا مقتضٰی یہی تھا کہ ان کو معجزہ اسی رنگ میں دیا جاتا، اسی بنا پر ان کو مُردوں کا زندہ کرنا، مادر زاد اندھوں کا اور برص کی بیماری والے کو اچھا کرنا، گارے کے جانور بنا کر اڑانا، دیا گیا۔

کوئی طبیب کتنا ہی ماہر فن ہو مگر وہ اپنے علاج سے نہ تو مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے اور نہ مادر زاد اندھے کو اچھا کر سکتا ہے اور نہ گارے کے جانوروں میں جان

[1] تفسیر خازن جلد ۲ صفحہ ۱۲۷ [illegible]

ڈال سکتا ہے خواہ وہ جالینوس زمانہ ہی کیوں نہ ہو مگر عیسٰی علیہ السلام اپنے طب روحانی یعنی معجزہ سے یہ تمام کام کرتے تھے اور تمام ماہرین فنِ طب کو عاجز کر دیتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس قوم میں مبعوث ہوئے نہ تو وہ فن طب سے واقف تھی نہ فن جادوگری سے آشنا، بلکہ اس قوم کا مایہ الافتخار فصاحت و بلاغت تھی، میدان فصاحت و بلاغت میں ان سے گوئے سبقت کوئی لے ہی نہیں سکتا تھا۔

غرض اس فن میں وہ لوگ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، لہٰذا قاعدہ مذکورہ کے لحاظ سے مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزہ اسی فن میں دیا جائے، اس بناء پر آپؐ کو قرآن شریف کا معجزہ دیا گیا۔ اس کی فصاحت و بلاغت کے آگے تمام فصحاء و بلغاءِ عرب نے سرِ تسلیم خم کر دیا کسی سے آج تک مقابلہ نہیں ہو سکا اور نہ قیامت تک ہو سکے گا۔

معجزہ چونکہ نبی کے دعوای نبوت کے صداقت کی دلیل ہوتا ہے لہٰذا قرآن شریف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی کامل دلیل ہے اس لیے خداوند تعالٰی نے سورۂ یٰسٓ کے ابتداء ہی میں آپؐ کی نبوت پر قرآن شریف ہی کو دلیل بنایا ہے (وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ ترجمہ: قسم ہے قرآن باحکمت کی کہ بے شک آپؐ منجملہ پیغمبروں کے ہے) یعنی آپ کے پیغمبر ہونے پر قرآن شریف ہی دلیل ہے۔

کفار کو قرآن شریف کے معجزہ ہونے میں یہ شبہ تھا کہ شاید اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود تصنیف کر لیا کرتے ہوں تو خداوند تعالٰی نے فرمایا کہ (وَمَا کُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ کِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ آپؐ کے متعلق اس شبہ کی تو بالکل گنجائش ہی نہیں ہے اس لیے

کہ آپ قرآن شریف سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھے ہوئے تھے اور نہ کوئی کتاب ہاتھ سے لکھ سکتے تھے کہ ایسی حالت میں کفار کچھ شبہ نکالتے کہ یہ لکھے پڑھے آدمی ہیں کتابیں دیکھ بھال کر کچھ مضامین جمع کر کے سُنا دیتے ہیں یعنی اگر آپ لکھے پڑھے ہوتے تو البتہ کسی قدر منشاءِ اشتباہ تو ہوتا گو وہ بھی بعد ظاہر ہوتے اعجازِ قرآن کے زائل ہو جاتا لیکن جب آپ لکھے پڑھے ہی نہیں ہیں بلکہ اُمّی ہیں تو اس شبہ کی تو بالکل گنجائش ہی نہیں ہے اس لیے کہ بے لکھا پڑھا آدمی تو معمولی کتاب بھی تصنیف نہیں کر سکتا چہ جائیکہ قرآن شریف جیسی کتاب بنا سکے اور آپ کا اُمّی ہونا قریش کے نزدیک آفتاب سے زیادہ روشن تھا اس لیے کہ آپ اُنہیں کے گھر میں پیدا ہوئے اور اُنہیں کے ہاتھوں میں پرورش پائی آپ کی زندگی کا ایک ایک منٹ قریش کی نظروں میں تھا، انصاف پرست آدمی کو اس کے بعد کسی دلیل کی حاجت باقی نہیں رہتی، لیکن معاندین اپنے عناد سے کب باز آ سکتے ہیں، لہٰذا معاندین کو خداوند تعالےٰ نے اس شبہ کا ایسا دندان شکن جواب دیا جس کے سننے کے بعد سر نہ اُٹھا سکے۔ فرمایا کہ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ٥ (ترجمہ: اے معاندین! اگر تم کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندۂ خاص پر تو اچھا پھر تم بنا لاؤ ایک سورۃ یعنی ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلہ ہو کیونکہ آخر تم لوگ بھی تو عربی زبان رکھتے ہو بلکہ تم تو عربی زبان میں بڑے مشّاق ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اتنے مشّاق بھی نہیں ہیں اور اپنے حمائیتیوں کو بھی بلاؤ جو خداوند تعالےٰ سے الگ تجویز کر رکھے ہیں اگر تم سچے ہو۔ اس پُر زور مطالبہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالےٰ نے یہ بھی فرما دیا کہ (ولن تفعلوا) قیامت تک بھی نہ کر سکو گے۔ یعنی قیامت تک بھی تم سے ایک ایسی سورۃ جو فصاحت و بلاغت میں قرآن شریف کی ہم پلہ ہو

نہیں بن سکے گی، بھلا یہ سُن کر ہیچ و تاب نہیں آیا ہو گا اور کیا کوشش کرنے میں کوئی دقیقہ باقی چھوڑا ہو گا۔ مگر باوجود اس کے ان کا عاجز ہو کر اپنا سا منہ لے کر بیٹھ رہنا کس قدر زبردست دلیل ہے قرآن شریف کے معجزہ ہونے کی۔

الحاصل اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ ان حضرات کو مختلف معجزے کیوں دیئے گئے اور اختلاف کی صورت موجودہ کیوں اختیار کی گئی، اس تقریر کو سننے کے بعد سمجھدار آدمی کو کوئی شبہ باقی نہیں رہتا بلکہ خداوند تعالٰی کی پُر حکمت کارروائی دیکھ کر سُبحان اللہ کا نعرہ بے ساختہ زبان پہ لے آتا ہے اور اس قسم کے اعتراضات کو (کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ معجزے کیوں نہیں دیئے گئے جو موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے تھے) نہایت بُری نظر سے دیکھنے لگتا ہے اور نہ اس کو یہ فکر باقی رہتی ہے کہ معجزات کا مقابلہ کرے کہ کس نبی کے معجزات بڑے ہیں اور کس کے چھوٹے، البتہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں مبعوث ہوتے تو بے شک آپ کو عصا و ید بیضاء ہی دیا جاتا۔ ایسا ہی اگر موسیٰ علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مبعوث ہوتے تو ان کو قرآن شریف ہی معجزہ دیا جاتا، علیٰ ہٰذا القیاس اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ہوتے تو آپ کو احیاءِ موتیٰ وغیرہ ہی دیا جاتا اور اگر عیسیٰ علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے تو ان کو قرآن شریف ہی معجزہ دیا جاتا۔

غرض قاعدہ مذکورہ بالا سمجھ لینے کے بعد عاقل کو تو کوئی دقّت پیش نہیں آتی اور سمجھانا بھی عاقل ہی کا مدِّ نظر ہوتا ہے بے عقل کو تو کوئی سمجھا ہی نہیں سکتا۔

دوسری قسم کے معجزات کی تشریح

جو معجزات انبیاء علیہم السلام کو بغرض تحدّی دیئے جاتے ہیں ان کی تشریح تو ہو چکی اور دوسرے قسم کے معجزات کی تشریح باقی ہے یعنی وہ معجزات جو بغرضِ تحدی و مقابلہ

نہیں دیتے جاتے ان معجزات کے ظہور کا سبب چونکہ ایک نہیں ہوتا جیسا کہ معجزاتِ تحدّی
کا تھا، بلکہ ان کے ظہور کے اسباب مختلف ہوتے ہیں لہٰذا ان کے لیے کوئی ایسا
قاعدہ کلیہ نہیں بتایا جا سکتا جو سب کے لیے حاوی ہو، البتہ اجمالاً اتنا کہا جا سکتا
ہے کہ یہ معجزات ان ضرورتوں کے پورا کرنے کے لیے ظاہر کیے جاتے ہیں جو علاوہ
تحدّی کے انبیاء علیہم السلام کے متعلق پیش آتی ہیں۔ مثلاً اگر کسی موقع پر پانی کی ضرورت
ہے مگر ظاہری اسباب کے اعتبار سے یہ ضرورت پوری نہیں ہو سکتی تو اللہ تعالیٰ
اسی ضرورت کو باطنی اسباب سے بصورت معجزہ پورا کر دیتے ہیں، گو مقصود بالذات
اس وقت اظہارِ معجزہ نہیں ہوتا بلکہ ضرورت کا پورا کرنا ہوتا ہے لیکن بوجہ نہ ہونے
ظاہری اسباب کے صورتِ معجزہ پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے
بنی اسرائیل کے لیے پانی کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اِضْرِبْ
بِعَصَاكَ الْحَجَرَ (عصا کو پتھر پر مارو، انہوں نے مارا تو بارہ چشمے پانی کے جاری ہو گئے
اور صحابہ کرامؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پانی کے نہ ہونے کی شکایت کی تو آپ
نے ایک پیالہ میں ذرا سا پانی لے کر اپنا ہاتھ مبارک اس میں ڈالا تو آپ کی انگلیوں
میں سے پانی جاری ہو گیا، اس قدر پانی نکلا کہ تمام لشکر سیراب ہو گیا اور
جس قدر ضرورت تھی پوری ہو گئی، اور بفرض اگر کہیں کھانے کی ضرورت ہو اور
ظاہری اسباب سے یہ ضرورت پوری نہ ہو سکے تو اس کو بصورتِ معجزہ پورا کیا جاتا
ہے جیسا کہ حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دعوت کا واقعہ ایامِ خندق میں کہ بہت
تھوڑا سا کھانا اس قدر زیادہ ہوا کہ تمام آدمیوں کے کھانے کے بعد بھی کچھ کم نہیں
ہوا، اور بھی اس قسم کے بہت سے واقعات ہوئے ہیں، اور اگر کہیں دشمن سے
بچانا منظور ہو مگر ظاہری اسباب وہاں موجود نہیں ہیں تو اس ضرورت کو بصورتِ معجزہ
پورا کر دیا جاتا ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے لیے دریا کو پھاڑ دیا گیا، اور عیسیٰ

علیہ السلام کو جسدِ عنصری کے ساتھ آسمان پر اٹھا لیا گیا، اور سُراقہ کی سواری کو خشک زمین میں دھنسا دیا گیا، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو مارنے کے ارادہ سے جا رہا تھا۔ اور اگر کسی نبی کو خاص اعزاز دینا منظور ہو مگر ظاہری اسباب اس کو پورا نہیں کر سکتے تو اس ضرورت کو بصورتِ معجزہ پورا کیا جاتا ہے جیسا کہ واقعۂ معراج اللہ تعالےٰ کو منظور ہوا کہ اپنے حبیب پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ اعزاز عطا فرما دے مگر ظاہری اسباب کی رو سے اس قدر مسافت ہزار ہا برس میں بھی طے نہیں ہو سکتی تھی تو اس کو بصورتِ معجزہ سرانجام دیا گیا۔ اور اگر دشمن کو ہلاک کرنا منظور ہو مگر ظاہری اسباب وفا نہیں کرتے تو اس ضرورت کو بصورتِ معجزہ پورا کیا جاتا ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مٹھی کنکریوں کا پھینکنا اور تمام لشکرِ کفار کی آنکھوں میں پڑنا، جنگِ بدر میں ہوا تھا۔

الحاصل یہ معجزات علاوہ تحدی کے باقی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لیے ہوتے ہیں جس قسم کی ضرورت ہو گی اسی رنگ کا معجزہ ہو گا۔ اس تقریر کے بعد ہر شخص کو معلوم ہو جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے یہ معجزات مختلف کیوں تھے، سب کو ایک قسم کے معجزے کیوں نہیں دیئے گئے اس لیے کہ جب ضرورتیں مختلف ہوں گی تو ان کے پورا کرنے کی صورتیں بھی مختلف ہوں گی اور جو معجزات بغرض تحدی دیے جاتے ہیں ان کے اختلاف کی وجہ اوپر گذر چکی۔

پیغمبروں کے پاس علم آنے کے ذرائع

جن حضرات کو خداوند تعالےٰ منصبِ نبوت کے لیے منتخب فرماتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ سے اپنی رضا و غیر رضا کا قانون بندوں کو پہنچا دیں ان حضرات کے پاس علم آنے کے تین طریقے ہیں جو قرآن شریف کی اس آیت میں بیان کیے گئے ہیں:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۚ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ (سورہ شوریٰ) ترجمہ: اور کسی بشر کی یہ شان

نہیں کہ اللہ تعالےٰ اس سے کلام کرے مگر یا تو الہام سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کسی فرشتہ کو بھیجدے کہ وہ خدا کے حکم سے جو خدا کو منظور ہو پیغام پہنچا دے وہ بڑا عالیشان بڑی حکمت والا ہے) آیت کا حاصل یہ ہے کہ مقربین کے پاس خداوند تعالےٰ کی طرف سے علم ملنے کے تین طریقے ہیں، ایک الہام یعنی دل میں کوئی اچھی بات ڈال دینا، بیداری میں یا خواب میں۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا خواب بھی حکم وحی میں ہوتا ہے۔ دوسرے پردے کے پیچھے سے کلام سنا دینا جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے سنا تھا یعنی صرف کلام سنائی دے نظر کچھ نہ آئے اور یہ حجاب کوئی جسم نہیں جو خداوند تعالےٰ کی ذاتِ اقدس کو پوشیدہ کر دیتا ہے، بلکہ حقیقت اس حجاب کی انسان کا ضعفِ ادراک ہے جس کی وجہ سے باوجود کمال ظہور نور ذات کے انسان ادراک سے عاجز ہے اور یہی ضعف ادراک کا حجاب تھا جو موسیٰ علیہ السلام کو رویت سے مانع ہوا تھا اور یہ مانع جنت میں دور کر دیا جائے گا اور اہل جنت کو خداوند تعالےٰ کی رویت کی قوت عطا کر دی جائے گی، تیسرا فرشتہ کو بھیجکر اس کے ذریعہ سے جو کچھ منظور ہو نبی کو پہنچا دیا جائے، غرض خداوند تعالےٰ جب مقربین کو اپنی رضا و غیر رضا کی اطلاع دیتے ہیں تو ان تین طریقوں کے ساتھ دیتے ہیں بالمشافہ و بالمعاینہ کسی سے بات نہیں کرتے اور (اِنَّہٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ) میں دونوں امور (یعنی بالمشافہ بات نہ کرنے اور تین طریقوں سے بات کرنے) کی علت بیان فرمائی ہے، پہلے امر یعنی بالمشافہ بات نہ کرنے کی علت (عَلِیٌّ) ہے یعنی وہ بڑا عالیشان ہے، انسان حالت موجودہ میں بوجہ ضعف ادراک اس سے بالمشافہ بات کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، اور دوسرے امر یعنی تین طریقوں سے بات کرنے کی علت (حکیم) ہے یعنی وہ بڑی حکمت والا ہے اس لیے اپنے بندوں کی مصلحت کا خیال فرما کر تین طریقے کلام کے مقرر فرما دیئے ہیں کیونکہ اگر کوئی طریقہ بھی کلام کا نہ ہوتا تو خداوند تعالےٰ کی رضا و غیر رضا کے معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ ہی نہ ہوتا اور یہ بندوں کی مصلحت کے خلاف ہے لہٰذا اپنی حکمت سے بندوں کی مصلحت کو

بھی فوت نہیں ہوتے دیا بلکہ رضا و غیر رضا کے معلوم کرنے کے تین طریقے مقرر فرما دیئے اور علوِ شان کو بھی محفوظ رکھا۔

نبوت کی تکمیل کے لیے ملائکہ کے انتخاب کی ضرورت

چونکہ نبی کے پاس علم آنے کے طریقوں میں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کسی فرشتہ کے ذریعہ سے نبی کو علم دیا جائے اور تمام طریقوں سے زیادہ واضح اور آسان طریقہ یہی ہے خصوصاً آسمانی کتابیں ہمیشہ اسی طریقہ سے بھیجی گئی ہیں اس لیے اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ملائکہ میں سے بھی بعض حضرات کو اس منصب کے لیے منتخب کیا جائے تاکہ احکامِ خداوندی کو رسولوں تک پہنچا دیں۔ جیسا کہ رسولوں کو منتخب کیا گیا ہے کہ احکامِ خداوندی کو عام لوگوں تک پہنچا دیں۔

غرض سلسلۂ نبوت و رسالت میں دو انتخابوں کی ضرورت ہے ایک انتخابِ ملائکہ جو احکام کو رسولوں تک پہنچائیں، دوسرا انتخاب معصوم انسانوں کا جو احکام عام لوگوں تک پہنچائیں۔ ان دونوں انتخابوں کے مجموعہ سے نبوت کی تکمیل ہو گئی، انہی دو انتخابوں کے متعلق ارشاد ہے: اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۝ سورہ حج، ترجمہ: اللہ تعالےٰ منتخب کر لیتا ہے فرشتوں میں سے احکام پہنچانے والے اور آدمیوں میں سے یقینی بات ہے کہ اللہ تعالےٰ خوب سننے والا خوب دیکھنے والا ہے، یعنی اللہ تعالےٰ تمام احوال سے خوب واقف ہے وہ اپنے علم میں ملائکہ اور انسانوں میں سے جس کو اس منصب کے لیے مناسب سمجھتا ہے منتخب فرما لیتا ہے اور عموماً ہر زمانہ میں ملائکہ میں سے اس منصب کے لیے حضرت جبرائیل علیہ السلام ہی کو منتخب کیا گیا ہے۔ قرآن شریف سب کا سب یقیناً حضرت جبرائیل علیہ السلام ہی لائے ہیں جیسا کہ قرآن شریف میں اس کی تصریح ہے۔۔۔۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ، سورہ شعراء، ترجمہ: کہ اس کو یعنی قرآن شریف کو روح الامین یعنی جبرائیل علیہ السلام لائے ہیں، بلکہ دوسری کتب الٰہیہ بھی غالباً جبرائیل علیہ السلام ہی

لائے ہیں لیکن آیت میں (رُسُلاً) جمع اس وجہ سے ہے کہ بعض موقعہ پر بعض احکام دوسرے فرشتے بھی لائے ہیں جیسا کہ (ولقد جاءت رسلنا ابراهيم) (ولقد جاءت رسلنا لوطاً) میں تصریح ہے۔ گو ان میں بھی رئیس جبرائیل علیہ السلام ہی تھے۔ غرض بعض موقعہ پر اور ملائکہ کو بھی بھیجا گیا ہے۔ لیکن عام طور پر یہ ڈیوٹی حضرت جبرائیل علیہ السلام ہی کے سپرد رہی ہے۔

ملائکہ کے پر دار ہونے کی وجہ

چونکہ سلسلۂ نبوت کی تکمیل کے لیے انتخاب ملائکہ کی بھی ضرورت تھی جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے لیکن وہ رہتے ہیں آسمانوں میں اور آسمان و زمین کے درمیان مسافت بہت لمبی ہے، بعض روایات کے اعتبار سے زمین سے آسمان تک پانچ سو سال کا راستہ ہے اور ہر آسمان کی چھت کی موٹائی بھی پانچ سو سال کا راستہ ہے تو گویا ساتویں آسمان کی چھت تک سات ہزار سال کا راستہ ہے تو اتنی دور سے احکام لانے کے لیے اس بات کی ضرورت تھی کہ کوئی تیز رفتاری کا انتظام کیا جائے ورنہ نبی کی تمام عمر میں ایک دفعہ بھی احکام کا آنا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ وہ جگہ جو بمنزلہ ڈاک خانہ کے قرار دی گئی ہے وہ جگہ ساتویں آسمان میں ہے اس مقام کا نام سدرۃ المنتہیٰ ہے جس قدر احکام عالم بالا سے نازل ہوتے ہیں پہلے وہاں پر نازل ہوتے ہیں پھر وہاں سے ملائکہ لے کر زمین پر لاتے ہیں گویا سدرۃ المنتہیٰ ملائکہ کو احکام ملنے کا ڈاک خانہ ہے اور وہی مقام ہے جبریل علیہ السلام کا جو عموماً اس ڈاک کے پہنچانے کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں اور وہ ڈاک خانہ زمین سے تقریباً سات ہزار سال کے راستہ کے فاصلہ پر ہے تو اتنی دور سے ڈاک لانے کے لیے بڑی زبردست تیز رفتاری کی ضرورت تھی اور اس کی متعدد صورتیں ہو سکتی تھیں، مثلاً کوئی ہوائی جہاز ڈاک لانے والے فرشتہ کو دیا جاتا یا کوئی دوسری سواری تیز رفتار مثل براق وغیرہ کے دی جاتی، غرض متعدد صورتیں تھیں لیکن

چونکہ سنت اللہ یہ ہے کہ اگر ایک کام کے لیے متعدد راستے ہوں تو ان میں سے وہ راستہ اختیار کیا جاتا ہے جو سب سے زیادہ آسان و مختصر ہو اس بنا پر خداوند تعالےٰ نے ملائکہ کو پر دار بنا دیا تاکہ وہ خود اُڑ کر چلے جائیں کسی سواری کی ضرورت ہی نہ ہو کیونکہ یہ راستہ نہایت ہی مختصر اور آسان ہے، ڈاک لیتے ہی لے اُڑے گا، جتنی دیر میں سواری کو پکڑ کر سوار ہوتا اتنی دیر میں پہنچ بھی جائے گا اور اس بات کی فکر بھی نہیں ہو گی کہ سواری کو کہاں باندھوں یا کہاں رکھوں اس کے متعلق ارشاد ہے۔ الحمد للہ فاطر السمٰوٰت والارض جاعل الملائکۃ رسلاً اولی اجنحۃ مثنیٰ وثلٰث وربٰع یزید فی الخلق ما یشاء ان اللہ علیٰ کل شیء قدیر ہ سورۂ فاطر (ترجمہ؛ حمد اللہ ہی کو لائق ہے جو آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے جو فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا ہے جن کے دو دو، تین تین، چار چار پر ہیں وہ پیدائش میں جو چاہے زیادہ کر دیتا ہے بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے) اس آیت میں پیغام سے مراد وحی کا لانا ہے رسولوں کی طرف، اور کچھ چار پروں پر منحصر نہیں بلکہ حسب مصلحت و ضرورت زیادہ بھی دیتے جاتے ہیں اسی کی طرف اشارہ ہے (یزید فی الخلق ما یشاء) ہیں کہ اللہ تعالےٰ جس قدر چاہے پر زیادہ عطا فرما دیتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ جبریل علیہ السلام کو جو عموماً اس ڈاک کے لیے منتخب ہوتے رہے ہیں اللہ تعالےٰ نے چھ سو پر عطا فرمائے ہیں اور وہ اس قدر تیز رفتار ہیں کہ بجلی بھی کیا ہو گی آنکھ کی پلک مارنے سے بھی پہلے پہنچ جاتے ہیں۔

غرض ڈاک لانے کی جگہ چونکہ بہت دور تھی لہٰذا جلدی پہنچنے کے لیے یہ صورت اختیار کی گئی کہ ملائکہ کو پر عطا کیے گئے اور سواری وغیرہ سے مستغنی کر دیئے گئے اور یہی راستہ اس کام کے لیے تمام راستوں سے مختصر و آسان تھا۔

پیغمبروں کی شریعتوں کے مختلف ہونے کی وجہ

گو اصول میں تمام انبیاء علیہم السلام متفق تھے مگر فروع کے اعتبار سے شریعتیں مختلف ہوتی رہیں اسی اختلاف کا سبب صحیح طور پر معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اکثر لوگوں کو طرح طرح کے خدشات پیش آئے کسی نے تو یہ کہا کہ اس سے خداوند تعالیٰ کا جہل لازم آتا ہے لہٰذا یہ جائز نہیں ہے کیونکہ ایک شریعت مقرر کر کے پھر اس کو کچھ عرصہ کے بعد منسوخ کر دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کو پہلے سے معلوم نہیں تھا کہ آگے چل کر یہ شریعت خلاف مصلحت واقع ہو گی۔

خداوند تعالےٰ چونکہ عالم الغیب ہے لہٰذا اس کی مقرر کردہ شریعت تو ایسی ہونی چاہیے جو قیامت تک نہ بدلے اس نسخ ہی کی وجہ سے اکثر لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے اور حضورؐ پر مفتری کا الزام لگایا جس کی تصریح اس آیت میں ہے (وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ) سورہ نحل، یعنی جب ہم کسی آیت کو بجائے دوسری آیت کے بدلتے ہیں یعنی ایک حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم دیتے ہیں حالانکہ اس کی مصلحت کو خداوند تعالےٰ ہی خوب جانتا ہے، تو آپ کو یہ کہتے ہیں کہ آپؐ نعوذ باللہ خدا پر افترا کرنے والے ہیں یعنی اپنے کلام کو خدا کی طرف نسبت کرتے ہیں مگر یہ لوگ جاہل ہیں مصلحت نسخ کو نہیں جانتے غرض اختلافِ شرائع کی وجہ نہ سمجھنے سے اس قسم کے خدشات لوگوں کو پیش آئے ہیں لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ اس کی اصلی وجہ بیان کر دی جائے تاکہ اس قسم کے خدشات رفع ہو جائیں۔

یہ سمجھنا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام مثل اطبّاء کے ہیں کہ اطبّاء جسمانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں، ایسا ہی انبیاء علیہم السلام روحانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں خداوند تعالےٰ شانہٗ ان کو روحانی بیماریوں کا طبیب و ڈاکٹر بنا کر بھیجتا ہے تو جس طرح

کوئی طبیب ایسا نہیں کرتا کہ تمام بیماروں کو ایک ہی نسخہ دے بلکہ اگر ایسا کرے تو اس کا یہ فعل نادانی پر مبنی ہوگا کیونکہ لوگوں کے مزاج مختلف ہیں، جوانوں کا مزاج بچوں اور بوڑھوں کے خلاف ہے اور ایک جوان کا مزاج دوسرے جوان کے خلاف ہے ایک ملک کے رہنے والوں کا مزاج دوسرے ملک کے رہنے والوں سے نہیں ملتا، تو اس اختلاف مزاج کے ہوتے ہوئے ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک ہی نسخہ سب کے مزاج کے موافق ہو سکے بلکہ ہر شخص کو اس کے مزاج کے موافق نسخہ دیا جاتا ہے اور یہی مصلحت کا تقاضا ہے۔

اسی طرح تمام لوگوں کے لیے ایک ہی شریعت مقرر نہیں کی جا سکتی کیونکہ لوگ مختلف الفطرۃ واقع ہوئے ہیں، ایک ہی شریعت سب کی فطرت کے موافق نہیں ہو سکتی اور خلافِ فطرت پر مجبور کرنا تکلیف مالایطاق ہے لہٰذا موافق فیصلہ (لَا یکلف اللّٰہ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا) ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ لوگوں کی فطرت کے موافق شریعت بھیجتے رہے۔

یا یوں سمجھنا چاہیئے کہ بچے کو پیدائش کے دن سے لے کر جب تک زندہ رہے غذا کی ضرورت ہے لیکن ہر ذی عقل جانتا ہے کہ ہر زمانہ میں اس کو ایک ہی غذا نہیں دی جاتی بلکہ ہر زمانہ میں اس کی فطرت کے موافق غذا دی جاتی ہے جب فطرت میں تبدیلی واقع ہوتی ہے تو غذا میں بھی تبدیلی لازمی ہوتی ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تو بچہ زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔

مثلاً پہلے روز ماں کے پیٹ سے نکلنے کے بعد بچے کی فطرت کے لیے ماں کے دودھ سے بہتر کوئی غذا نہیں ہوتی اسی لیے اس کے پیٹ سے نکلنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ اس کی ماں کے پستانوں میں دودھ پیدا کر دیتا ہے اور اس کی رحمت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ ایسا کرے۔

اگر کوئی شخص بچے کو پہلے ہی روز بجائے دودھ کے روٹی کھلانے لگے یا زردہ بریانی کھلانے لگے تو گو یہ غذا فی نفسہٖ بہت اچھی ہے لیکن چونکہ بچے کی فطرت کے خلاف ہے لہٰذا وہ مرجائے گا ہرگز زندہ نہیں رہ سکے گا لیکن جب کچھ عرصہ کے بعد بچے کی فطرت میں تبدیلی آتی ہے تو غذا بھی بدل دی جاتی ہے اور ایک دن ایسا بھی آتا ہے کہ اس کو ماں کے دودھ سے نفرت آنے لگتی ہے حالانکہ یہ وہی دودھ ہے جس کے بغیر اس کو چین نہیں آتا تھا اور جس غذا کے کھانے سے زندہ ہی نہیں رہ سکتا تھا وہ غذا ماں کے دودھ کی طرح مرغوب معلوم ہوتی ہے

الحاصل لوگوں کی فطرت چونکہ مختلف ہے اس لیے ہر زمانہ کے لوگوں کی فطرت کے موافق شریعت آتی رہی ہے اور یہی مطلب ہے (لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا) یعنی ہم نے تم میں سے ہر امت کے لیے خاص شریعت و طریقت تجویز کی تھی۔ اسی آیت میں یہود و نصارٰی کو خطاب ہے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے سے اس وجہ سے انکار کیا کہ آپؐ نئی شریعت لائے تو اللہ تعالےٰ نے جواب دیا کہ شریعت کی تبدیلی کوئی قابل تعجب نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے تم میں سے بھی ہر ایک کو خاص خاص شریعت مل چکی ہے۔ مثلاً یہود کے لیے توراۃ تھی اور نصارٰی کے لیے انجیل، ایسا ہی اگر حسبِ مصلحت زمانہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو نئی شریعت یعنی قرآن شریف عطا کیا گیا ہے تو اس میں انکار کی کیا بات ہے۔ غرض شریعت کی تبدیلی مصلحت کے خلاف نہیں ہے بلکہ عین مصلحت ہے۔ البتہ اگر لوگوں کی فطرت مختلف نہ ہوتی بلکہ ہر زمانہ میں لوگوں کی فطرت یکساں ہوتی تو بیشک ایک ہی شریعت سب کو دی جاتی اور ایک شریعت کا دینا ہی مصلحت ہوتا اور یہی مطلب ہے (وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً) کا یعنی اگر اللہ تعالےٰ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی امت کر دیتے جس کی صورت یہ ہوتی کہ تمام

لوگوں کو ایک ہی فطرت پر پیدا کرتے اور سب کو ایک ہی شریعت دیتے پھر تو سب ایک ہی امت ہو جاتے، یعنی خداوند تعالےٰ کو اس بات کی قدرت تھی کہ وہ ایسا کر دیتا مگر ایسا کرنا چونکہ مصلحت کے خلاف تھا جس کی تشریح عنقریب آئے گی۔ لہٰذا ایسا نہیں کیا گیا بلکہ مختلف فطرتیں دے کر مختلف شریعتیں عطا کی گئیں۔

پیغمبروں کی تعلیم سے سب لوگ برابر مستفید نہیں ہوتے!

انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے تمام لوگ یکساں فائدہ نہیں اُٹھاتے بلکہ کوئی زیادہ فائدہ اُٹھاتا ہے کوئی کم اور کوئی بالکل ہی محروم رہتا ہے ناواقف آدمی کو اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید تعلیم میں کچھ نقصان ہے جس کی وجہ سے سب کو فائدہ یکساں نہیں ہوا حالانکہ یہ وجہ نہیں ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم اعلیٰ درجہ کی کامل ہوتی ہے کوئی تعلیم ان کی تعلیم سے بہتر ہو ہی نہیں سکتی، اور نہ وہ خود چاہتے ہیں کہ ہماری تعلیم سے کوئی محروم رہے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی زمینِ فطرت مختلف ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے کسی کی فطرتِ زمین اچھی ہے اور کسی کی خراب، اچھی فطرت والے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور بُری فطرت والے محروم رہتے ہیں۔ خداوند تعالےٰ نے قرآن شریف میں اس مسئلہ کو بارش کی مثال میں سمجھایا ہے (وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُہٗ بِاِذْنِ رَبِّہٖ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا) سورہ اعراف، ترجمہ اور جو زمین ستھری ہوتی ہے اس کا پیداوار خدا کے حکم سے خوب نکلتا ہے اور جو خراب ہے اس کا پیداوار اگر نکلے بھی تو بہت کم نکلتا ہے مطلب یہ ہے کہ بارش تو سب جگہ برابر برستی ہے اور اس میں فی نفسہ کوئی نقصان نہیں ہوتا مگر باوجود اس کے کہیں پیداوار بہت اچھی ہوتی ہے اور کہیں بہت کم اور کہیں پھول پیدا ہوتے ہیں اور کہیں کانٹے۔ جیسا کہ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست — در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

ایسا ہی انبیاء علیہم السلام کی تعلیم ایک روحانی بارش ہے اس کی لطافت و کمال میں تو

کوئی کلام نہیں ہے لیکن جس کی زمینِ فطرت خراب ہے وہ مستفید نہیں ہو سکتا اور جس کی زمینِ فطرت اچھی ہے وہ فائدہ اُٹھاتا ہے اس سے تعلیم پر کوئی دھبّہ نہیں آسکتا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس مسئلہ کو بارش کی مثال سے واضح فرمایا ہے (مَثَلُ مَا بَعَثَنِیَ اللّٰہُ بِہٖ مِنَ الْھُدٰی وَالْعِلْمِ کَمَثَلِ الْغَیْثِ الْکَثِیْرِ اَصَابَ اَرْضًا فَکَانَ مِنْھَا نَقِیَّۃٌ قَبِلَتِ الْمَاءَ فَاَنْبَتَتِ الْکَلَاءَ وَالْعُشْبَ الْکَثِیْرَ وَکَانَتْ مِنْھَا اَجَادِبُ اَمْسَکَتِ الْمَاءَ فَنَفَعَ اللّٰہُ بِھَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا وَاَصَابَ مِنْھَا طَائِفَۃً اُخْرٰی اِنَّمَا ھِیَ قِیْعَانٌ لَا تُمْسِکُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ کَلَاءً فَذٰلِکَ مَثَلُ مَنْ فَقُہَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ وَنَفَعَہٗ بِمَا بَعَثَنِیَ اللّٰہُ بِہٖ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ وَمَثَلُ مَنْ لَّمْ یَرْفَعْ بِذٰلِکَ رَاْسًا وَّلَمْ یَقْبَلْ ھُدَی اللّٰہِ الَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِہٖ بخاری باب فضل من علم وعلّم، (ترجمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت وعلم مجھ کو دے کر بھیجا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے زور کا مینہ جو زمین پر برسا پس بعضی زمین عمدہ تھی اس نے پانی پی لیا اور سوکھی اور ہری گھاس اُگائی اور بعضے قطعے اس زمین کے سخت تھے انہوں نے پانی کو روک رکھا (اور پیا نہیں) پھر اللہ تعالیٰ نے فائدہ سے فائدہ دیا لوگوں کو اور لوگوں نے اس سے پانی پیا اور پلایا (اپنے جانوروں کو) اور کھیتی کی اور بعضے قطعوں پر اس زمین کے پانی پڑا وہ صاف میدان تھے، نہ تو وہ پانی کو روکتے ہیں نہ گھاس اگاتے ہیں پس یہ (تینوں قسمیں جو اوپر مذکور ہوئیں) مثال میں اس شخص کی جس نے سمجھ حاصل کی اللہ کے دین میں اور فائدہ دیا اس کو اس چیز نے جس کو اللہ نے مجھے دیکر بھیجا اس نے علم حاصل کیا اور دوسروں کو تعلیم کیا اور مثال اس شخص کی جس نے ادھر سر نہ اٹھایا اور نہ قبول کیا اللہ کی اس ہدایت کو جو میں دیکر بھیجا گیا ہوں) مثال کا حاصل یہ ہے کہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جنہوں نے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچایا دوسرے وہ لوگ جنہوں نے خود تو فائدہ نہیں اٹھایا، یعنی خود شریعت پر عمل نہیں کیا لیکن دوسروں کو فائدہ

پہنچایا یعنی تعلیم دی اور تیسرے وہ لوگ جو نہ خود فائدہ اُٹھا سکے اور نہ دوسروں کو فائدہ پہنچا سکے۔

مثلاً اگر گائے اور بھینس گوشت سے فائدہ نہ اُٹھائے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ گوشت میں کوئی خرابی ہے بلکہ اس کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ اس کو گوشت سے نفرت ہے۔ ایسا ہی شیر گھانس سے فائدہ نہیں اُٹھاتا تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ گھانس کا قصور ہے بلکہ شیر کی فطرت ایسی واقع ہوئی ہے کہ اس کو گھانس سے نفرت ہے۔ اگر بھوک سے مر بھی جائے تو گھانس نہیں کھائے گا، پس اسی طرح جن لوگوں کو فطرۃً شریعت سے نفرت ہے جیسا شیر کو گھانس سے اور گلئے بھینس کو گوشت سے، وہ کبھی بھی شریعت سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے خواہ مر بھی جائیں، جیسا کہ ابوجہل وغیرہ اور جن لوگوں کی فطرت کو تعلیم انبیاء علیہم السلام سے مناسبت ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ وہ مر بھی جائیں تو شریعت کو نہیں چھوڑیں گے جیسا کہ شیر گوشت کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ایسا ہی اگر آپ چاہیں کہ گائے بھینس انڈے دے تو ہرگز نہیں دے سکے گی اور مرغی بچے نہیں دے سکے گی خواہ آپ کتنا ہی زور لگائیں، بلکہ گائے بھینس بچے دے گی اور مُرغی انڈے۔ ایسا ہی ہر نوع کے خواص جو اس کی فطرت کے ساتھ مخصوص ہیں اس کے خلاف اگر آپ چاہیں تو ہرگز ممکن نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے باوجودیکہ تمام حیوانوں کو ایک پانی سے پیدا کیا ہے، مگر ہر قسم کے جانداروں کو صورتِ نوعیہ جدا جدا عطا فرمائی ہے اور ہر ایک کی صورتِ نوعیہ کے خواص بھی علیحدہ علیحدہ مقرر فرما دیئے ہیں ایک نوع کے خواص کا صدور دوسرے نوع سے ممکن نہیں ہے اس کے متعلق ارشاد ہے:

(وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّۃٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْہُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِہٖ وَمِنْہُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی رِجْلَیْنِ وَمِنْہُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰٓی اَرْبَعٍ) سورہ نور، ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے ہر چلنے والے جاندار کو پانی سے پیدا کیا ہے پھر ان میں بعض تو وہ ہیں جو اپنے پیٹ کے بل چلتے ہیں اور بعض ان میں وہ ہیں جو دو پیروں پر چلتے ہیں اور بعض ان میں وہ ہیں جو چار پیر چلتے ہیں) پانی سے مراد یا تو نطفہ ہے اور یا معنی متعارف یعنی بارش کا پانی، چونکہ

جانداروں کا بقا پانی پر ہے اور ان کے مادہ کا جزء ہے اس بنا پر خلق کل دابۃ من ماء فرمایا ہے اور جب پانی سے مراد نطفہ لیا جائے تو اس صورت میں معنی ظاہر ہیں، مطلب یہ ہے کہ باوجود یکہ پیدائش سب کی پانی سے ہے مگر پھر صورتِ نوعیہ جدا جدا ہے کوئی پیٹ کے بل چلتا ہے جیسا سانپ وغیرہ کوئی دو پاؤں پر جیسا کہ انسان وغیرہ کوئی چار پر جیسا کہ چار پائے اور ہر ایک کی صورتِ نوعیہ کے خواص جدا ہیں، کوئی گوشت سے فائدہ اٹھاتا ہے کوئی گھاس سے، کوئی بچے دیتا ہے کوئی انڈے، تو اب جس جاندار کی فطرت گوشت خوار واقع ہوئی ہے وہ گھاس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور جو گھاس سے فائدہ اٹھاتا ہے وہ گوشت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا، جو انڈے دیتا ہے وہ بچے نہیں دے سکتا اور جو بچے دیتا ہے وہ انڈے نہیں دے سکتا، علیٰ ہٰذا القیاس باقی خواص۔

اسی طرح جن لوگوں کی فطرت شریعت کے خلاف واقع ہوئی ہے اور کفر و شرک کے موافق وہ شریعت سے ہرگز فائدہ نہیں اٹھا سکتے، مگر ان کے فائدہ نہ اٹھانے سے شریعت پر کوئی دھبہ نہیں آسکتا اور نہ تعلیم انبیاء علیہم السلام پر کوئی حرف آسکتا ہے۔

یا یوں سمجھنا چاہیے کہ آفتاب جب نکلتا ہے تو وہ اپنی روشنی کو ہر جگہ برابر ڈالتا ہے اور نہ یہ چاہتا ہے کہ کسی جگہ روشنی پڑے اور کسی جگہ نہ پڑے مگر جہاں زمین ہموار ہوتی ہے وہاں روشنی پڑتی ہے اور جہاں ہموار نہیں ہوتی بلکہ کوئی دیوار وغیرہ کی آڑ ہوتی ہے وہاں روشنی نہیں پڑتی تو کیا یہ آفتاب کا قصور ہے ہرگز نہیں، ایسا ہی جب آفتاب نبوت طلوع کرتا ہے تو وہ یہ نہیں چاہتا کہ میرا نور کسی جگہ پر پڑے اور کسی جگہ پر نہ پڑے بلکہ وہ یہی چاہتا ہے کہ میں ہر شخص کو اپنے نور سے منور کردوں مگر جن لوگوں کی زمینِ فطرت ناہموار ہوتی ہے وہ نورِ نبوت سے محروم رہتے ہیں مگر اس محرومی سے آفتاب نبوت پر کوئی حرف نہیں آسکتا خداوند تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن شریف میں سراج منیر فرمایا ہے اور آفتاب کو بھی سراج سے تعبیر فرمایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کو بمنزلہ آفتاب قرار دیا ہے یا یوں سمجھنا چاہیئے کہ اگر چمگادڑ آفتاب کو نہ دیکھ سکے تو کیا یہ آفتاب کا قصور ہے ہرگز نہیں جیسا کہ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

گر نہ بیند بروز شپرۂ چشم چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اختلافِ فطرت کے اختیار کرنے کی وجہ

جب تمام لوگ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے اس وجہ سے مستفید نہیں ہوتے کہ سب کی فطرت مساوی نہیں ہے تو خداوند تعالیٰ نے فطرتیں مختلف کیوں بنائیں جس کی وجہ سے اکثر لوگ محروم رہے، ایسا کیوں نہیں کیا کہ سب کی فطرت یکساں بناتے تاکہ سب کے سب تعلیم سے برابر فائدہ اُٹھاتے۔

اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ صورتیں دو تھیں ایک یہ کہ تمام چیزوں کو مختلف الفطرت بنایا جائے اور دوسری یہ کہ تمام چیزوں کو مساوی الفطرت بنایا جائے لیکن اللہ تعالیٰ چونکہ حکیم ہے لہٰذا اس نے دونوں صورتوں میں سے وہ صورت اختیار کی ہے جو بندوں کے لیے زیادہ مفید تھی یعنی اختلافِ فطرت والی صورت کو اختیار کیا اور تمام چیزوں کو مختلف الفطرۃ بنایا جیسا کہ مشاہدہ سے واضح ہے کیونکہ.... سب چیزوں کی فطرت کو یکساں و متحد بنانے کی صورت میں کئی خرابیاں ہوتی تھیں۔

مثلاً اگر زمین کے قطعوں کو مختلف الفطرۃ نہ بنایا جاتا بلکہ تمام قطعے متحد الفطرۃ ہوتے تو پھر زمین ایسی نہ ہوتی کہ کہیں اونچی کہیں نیچی کہیں پانی کہیں خشکی کہیں مکانات و درخت کہیں صاف میدان بلکہ یا تو سب پر پانی ہوتا تو اس صورت میں زمین پر رہنا ہی ممکن نہ ہوتا یا کہیں بھی پانی نہ ہوتا تو اس صورت میں زندگی ہی ممکن نہ ہوتی، یا ہر جگہ درخت ہوتے تو چلنا پھرنا ہی دشوار ہوتا بلکہ رہنا ہی ممکن نہ ہوتا یا کہیں بھی درخت نہ ہوتے تو سایہ کا انتظام نہ ہوتا اور لکڑیاں جلانے اور مکانات بنانے کے لیے میسر نہ ہوتیں، غرض تمام صورتوں میں دقتیں تھیں لہٰذا یہی بہتر ہے کہ کہیں پانی ہے کہیں خشکی کہیں درخت ہیں کہیں صاف میدان اور اگر ایسا ہی انسانوں میں اختلافِ فطرت

نہ ہوتا تو پھر تمام انسانوں میں کوئی امتیاز ہی باقی نہ رہتا کیونکہ پھر تو سب کے قد بھی برابر ہوتے رنگ بھی ایک ہوتا غرض کوئی امتیاز نہ ہوتا تو ایک دوسرے کی پہچان ہی ناممکن ہوتی، اور پھر یہ بھی نہ ہوتا کہ ایک دوسرے کے نطفہ سے پیدا ہوتے ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آتی کیونکہ جب سب کی فطرت برابر ہے تو کیا وجہ ہے کہ زید عمرو کے نطفہ سے پیدا ہو اور عمرو زید کے نطفہ سے پیدا نہ ہو، بلکہ پیدائش کی صورت یہ ہوتی کہ اللہ تعالٰے یونہی اپنی قدرت سے سب کو پیدا کر دیتا جیسا کہ آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تھا اور پھر یہ بھی نہ ہوتا کہ ایک شخص آج پیدا ہوتا اور دوسرا کل بلکہ سب کو ایک دم پیدا کیا جاتا ورنہ ترجیح بلا مرجح لازم آتی، تو قیامت تک کے آنے والے یک دم پیدا کر دیئے جاتے تو اس صورت میں ایک خرابی تو یہ ہوتی کہ زمین تنگ ہو جاتی اور دوسری خرابی یہ ہوتی کہ جب ایک دوسرے کے نطفہ سے پیدا نہ ہوتے تو آپس میں ایک دوسرے سے اُنس و محبت نہ ہوتی بوجہ نہ ہوتے تعلق رشتہ داری کے تو اس پر کئی خرابیاں مرتب ہوتیں، قتل و قتال زیادہ ہوتا، کوئی مر جاتا تو مُردہ سڑتا رہتا کوئی اُٹھاتا ہی نہیں، اب تو غریب سے غریب بھی مر جاتا ہے تو بہتیرے آدمی بھاگے بھاگے آتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے میرا باپ تھا کوئی کہتا ہے میرا بھائی تھا کوئی کہتا ہے میرا چچا تھا غرض سینکڑوں تعلقات والے پیدا ہو جاتے ہیں، مگر جب پیدائش کا یہ سلسلہ نہ ہوتا تو کوئی پوچھتا ہی نہیں، کوئی دوسرے کی معاونت کرنے کے لیے تیار نہ ہوتا اس کے متعلق ارشادِ باری تعالٰے ہے (وھو الذی خلق من الماءِ بشرًا فجعلہ نسبًا و صھرًا) سورۃ فرقان، ترجمہ: اور وہ ایسا ہے جس نے پانی سے (یعنی نطفہ سے) آدمی کو پیدا کیا پھر اس کو خاندان والا اور سسرال والا بنایا) انسان کے دو خاندان ہوتے ہیں ایک باپ کی طرف سے دوسرا ماں کی طرف سے۔

مطلب یہ ہے کہ خداوند تعالٰے انسان کی پیدائش کا ایسا طریقہ اختیار کیا ہے کہ پیدائش کے ساتھ ساتھ دو خاندانوں کے ساتھ تعلقات بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ تعلقات ہی مدارِ معاونت ہیں اور پھر جب شادی کر لیتا ہے تو ایک تیسرا رشتہ بھی پیدا ہو جاتا ہے جس کو

رشتہ، سسرال کہتے ہیں، غرض اس کی قدرت کاملہ نے ایک حقیر نطفہ کو اس قدر پھیلایا کہ سینکڑوں علاقوں والا ہو گیا اور یوں ہی بغیر نطفہ کے پیدا کرنے میں یہ تعلقات نہ پیدا ہوتے۔

ایک دفعہ موسیٰ علیہ السلام نے خداوند تعالیٰ کی جناب میں عرض کی کہ ایک انسان کو دوسرے کے پیٹ میں رکھکر پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے، حالانکہ آپ کو قدرت ہے کہ آپ بغیر کسی کے پیٹ میں رکھنے کے بھی پیدا کر سکتے ہیں تو خداوند تعالےٰ نے فرمایا کہ اچھا ہم کسی وقت سمجھا دینگے اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کہیں جنگل میں جارہے تھے تو حسن اتفاق سے دو تین مردے نظر آئے تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ ان کا کوئی رشتہ دار یہاں نہیں ہے، لہٰذا ان کا دفن وغیرہ تمہارے ذمہ ہے موسیٰ علیہ السلام نے بڑی مشکل سے ان کو دفن کیا اور آگے چلے تو باری تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ وہ سوال جو تم نے کیا تھا پھر اس کے متعلق کوئی بات چیت نہیں کی تو موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ مولیٰ میری سمجھ میں آگیا ہے، مگر مہربانی فرما کر اور کوئی مردہ نہ میری سپرد کرنا، غرض موسیٰ علیہ السلام سمجھ گئے کہ اگر موجودہ صورت تعلقات کی نہ ہوتی تو مُردے ہی کوئی نہ اُٹھاتا۔

اور علاوہ اس کے خداوند تعالیٰ کی قدرت کے عجائبات اختلاف فطرت کی صورت میں زیادہ ظاہر ہوتے بہ نسبت مساوات فطرت کے، کیونکہ مساوات فطرت کی صورت میں یا تو سب خوبصورت ہوتے یا سب بدصورت، یا سب اندھے ہوتے یا سب آنکھوں والے، غرض سب ایک ہی حالت پر ہوتے تو جس حالت پر بھی ہوتے تو یہی سمجھتے کہ یونہی ہوا کرتے ہیں بنانے والے کی طرف توجہ ہی نہ ہوتی، لیکن جب کوئی خوبصورت ہو اور کوئی بدصورت تو ضرور خیال آئے گا کہ بنانے والا بڑا زبردست ہے جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے، علیٰ ہٰذا القیاس باقی حالتیں، ایسا ہی اگر تمام پھل ایک ہی حالت پر ہوتے، مثلاً خربوزے سارے میٹھے ہی ہوتے یا سارے پھیکے علیٰ ہٰذا القیاس دیگر پھل تو لوگ یہی سمجھتے کہ یوں ہی ہوا کرتے ہیں، مگر جب باوجودیکہ کھیت ایک ہے اور ایک ہی پانی سے سیراب کیا گیا ہے لیکن پھر پھلوں کا ذائقہ ایک نہیں ہے تو ضرور خیال آئے گا کہ کوئی بڑی زبردست طاقت ہے جو اپنے تصرف سے جیسے چاہے میٹھا بنا دے جیسے چاہے پھیکا بنالے

تو اس قدرت کے نظارہ کو دیکھ کر انسان خالق کی طرف متوجہ ہوگا اسی حکمت کی طرف اشارہ ہے
اس آیت میں (و فی الارض قطع متجورات من اعناب و زرع و نخیل صنوان
و غیر صنوان یسقی بماء واحد و نفضل بعضھا علیٰ بعض فی الاکل ان فی ذٰلک لآیٰت
لقوم یعقلون۔) سورۃ الرّعد، ترجمہ: اور زمین میں پاس پاس مختلف قطعے ہیں اور
انگوروں کے باغ ہیں اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں ہیں جن میں بعضے تو ایسے ہیں کہ ایک تنہ
سے اوپر جاکر دو تنے ہوجاتے ہیں اور بعضے دو تنے نہیں ہوتے سب کو ایک ہی طرح کا پانی دیا جاتا ہے
اور ہم ایک کو دوسرے پر پھلوں میں فوقیت دیتے ہیں، ان امور میں سمجھداروں کے واسطے دلائل ہیں
یعنی سمجھدار آدمی جب دیکھتا ہے کہ ایک کھیت کا پھل رنگ میں ذائقہ میں بو میں شکل میں غرض سب
باتوں میں مختلف ہے حالانکہ سب کو پانی ایک ہی دیا گیا ہے تو اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ یہ اختلاف
بغیر قادر مختار کے دوسرے سے ممکن نہیں ہے مگر اس نتیجہ پر سمجھدار ہی پہنچ سکتے ہیں اسی لیے
فرمایا (ان فی ذٰلک لآیات لقوم یعقلون)

اور ایسا ہی انسان کو ماں کے پیٹ میں رکھ کر پیدا کرنے اور پھر آہستہ آہستہ جوان بنانے اور
پھر بوڑھا بنانے میں جو قدرت کے کرشمے نظر آتے ہیں وہ یوں ہی یکدم جوان پیدا کرنے میں نظر
نہیں آتے کیونکہ اوّل تو ماں کے پیٹ ہی میں بہت سے عجائباتِ قدرت دکھاتے ہیں جن کو
دیکھتے ہی بے ساختہ (فتبارک اللہ احسن الخالقین) کا نعرہ زبان پر آتا ہے جس کے متعلق
ارشاد ہے (ثم جعلناہ نطفۃ فی قرار مکین ثم خلقنا النطفۃ علقۃ فخلقنا العلقۃ
مضغۃ فخلقنا المضغۃ عظاما فکسونا العظم لحما ثم انشاناہ خلقا اٰخر فتبارک
اللہ احسن الخالقین۔ سورہ مومنون) پھر ہم نے اس کو نطفہ سے بنایا جو ایک محفوظ مقام
(رحم میں) میں رہا پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنا دیا پھر ہم نے اس خون کے لوتھڑے کو
گوشت کی بوٹی بنا دیا پھر ہم نے اس بوٹی کو ہڈیاں بنا دیا پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا
دیا (جس سے وہ ہڈیاں ڈھک گئیں) پھر ہم نے اس کو ایک دوسری مخلوق بنا دیا (یعنی اس میں روح

ڈال دی) سو کیسی بڑی شان ہے اللہ کی جو تمام صناعوں سے بڑھکر ہے) کیونکہ کوئی دوسرا صانع روح نہیں ڈال سکتا غرض اس قدر انقلابات کے بعد انسان ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے اور پھر یہ بھی فرما دیا ہے کہ یہ تمام کاریگری تین اندھیروں میں ہوتی ہے (یخلقکم فی بطون امھتکم خلقا من بعد خلق فی ظلمت ثلث) سورہ زمر، ترجمہ: وہ تم کو ماؤں کے پیٹ میں ایک کیفیت کے بعد دوسری کیفیت پر بناتا ہے تین تاریکیوں میں) ایک تاریکی شکم کی دوسری رحم کی، تیسری اس جھلی کی جس میں بچہ لپٹا ہوا ہوتا ہے اور پیدائش کے وقت اپنی قدرت کا نظارہ دکھاتے ہیں کہ خوبی سے بچہ کو نکالتے ہیں کہ باوجود راستہ کے تنگ ہونے کے بچہ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی اسی کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں (خلقہ فقدرہ ثم السبیل یسرہ) سورہ عبس، ترجمہ: اس کی صورت بنائی پھر اس (کے اعضا) کو انداز سے بنایا پھر اس کو (نکلنے کا) راستہ آسان کر دیا ورنہ بچے کی کیا حقیقت تھی کہ وہ ایسے تنگ موقع سے بسلامت باہر آسکتا۔

پھر دوسری قدرت یہ دکھاتے ہیں کہ بچے کے نکلتے ہی ماں کے پیٹ سے دودھ کی دو نہریں جاری کر دیتے ہیں اور پھر تیسرا کمال یہ دکھلاتے ہیں کہ بچہ کو دودھ پینے کا طریقہ تعلیم فرماتے ہیں نکلتے ہی بچہ اس خوبی سے دودھ پینا شروع کرتا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے، ہماری طاقت سے باہر تھا کہ ہم بچہ کو دودھ پینا سکھا سکتے، پھر روزانہ بچے میں اپنی قدرت کا تماشا دکھاتے ہیں ایسا ایسا گرتا ہے کہ اگر بڑا آدمی گرتا تو سلامت نہ رہتا لیکن اپنی قدرت سے ایسا محفوظ رکھتے ہیں کہ انسان دیکھتا رہ جائے پھر ایسی ضعیف ہستی کو جوان بنا کر دکھاتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ ضعیف کو قوی بنا سکتے ہیں اور پھر جوان ہونے کے بعد بسا اوقات بوڑھا بنا دیتے ہیں تاکہ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ جیسا ان کو ضعیف کو قوی بنانا آتا ہے ایسا ہی قوی کو ضعیف بنانا بھی جانتے ہیں اور بوڑھا بنانے میں ایک اور وہم کا دور کرنا بھی منظور ہوتا ہے وہ یہ کہ شاید کوئی یہ سمجھے کہ بچہ جو جوان وطاقتور ہوا ہے محض غذا کھلانے کی وجہ سے ہوا ہے خداوند تعالیٰ کی قدرت سے نہیں ہوا، لہٰذا بوڑھا کر کے دکھاتے ہیں کہ اگر غذا نے اس کو طاقتور بنایا تھا تو اب بھی اس کو خوب غذا کھلا کر دیکھو کہ وہ غذا طاقتور بناتی ہے یا نہیں پس جب مشاہدہ ہو جاتا ہے کہ باوجود غذا کھلانے کے ضعیف و

ناتواں ہوا چلا جاتا ہے اور جتنی غذا زیادہ کھاتا ہے طاقت تو نہیں بڑھتی مگر بلغم کے ڈھیر لگائے چلا جاتا ہے تو یقین ہو جاتا ہے کہ طاقت کا دینا خدا ہی کے قبضہ میں تھا اس کے متعلق ارشاد ہے (اللہ الذی خلقکم من ضعف ثم جعل من بعد ضعف قوۃ ثم جعل من بعد قوۃ ضعفا وشیبۃ ط یخلق ما یشآء وھو العلیم القدیر) سورہ روم ترجمہ: اللہ ایسا ہے جس نے تم کو ناتوانی کی حالت میں بنایا پھر ناتوانی کے بعد توانائی عطا کی پھر توانائی کے بعد ضعف اور بڑھاپا کیا وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ جاننے والا اور قدرت رکھنے والا ہے۔ اوّل ضعف سے مراد بچپن کی حالت ہے اور قوت سے مراد جوانی اور دوسرے ضعف سے مراد بڑھاپا ہے، غرض اس قسم کی سینکڑوں باتیں ہیں جو غور کرنے سے معلوم ہوتی ہیں۔

الحاصل اختلاف فطرت کی صورت میں وہ خرابیاں بھی لازم نہیں آتیں جو مساواتِ فطرت کی صورت میں لازم آتی تھیں اور خداوند تعالیٰ کی قدرت کے عجائبات بھی زیادہ نظر آتے ہیں جو مساواتِ فطرت کی صورت میں نظر نہیں آسکتے لہٰذا خداوند تعالیٰ نے اختلافِ فطرت کی صورت کو اختیار فرمایا۔

پیغمبر کسی دوزخی کو جنتی نہیں بنا سکتے

خداوند تعالیٰ نے تمام مخلوقات کے پیدا کرنے سے بھی پہلے اس بات کا فیصلہ کر دیا ہے کہ فلاں شخص دوزخی ہے اور فلاں شخص جنتی ہے، غرض تمام دوزخیوں اور جنتیوں کی تعداد ضبط کر دی ہے اس تعداد میں کمی بیشی ممکن نہیں ہے، انبیاء علیہم السلام کے تشریف لانے کے بعد اس تعداد میں بالکل فرق نہیں آتا جو دوزخی لکھے ہوئے تھے وہ ان کے آنے پر بھی دوزخی ہی رہتے ہیں ایک بھی ان میں سے جنتی نہیں بن سکتا اور جو جنتی لکھے ہوئے ہیں وہ ان کے آنے پر بھی جنتی ہی رہتے ہیں، غرض انبیاء علیہم السلام کے آنے کے بعد جنتیوں اور دوزخیوں کی شمار میں ایک آدمی کا فرق بھی نہیں پڑتا، ترمذی شریف[1] میں حدیث ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے پاس تشریف لائے اور آپ کے ہاتھ میں دو کتابیں تھیں آپ نے فرمایا تم جانتے ہو یہ کتابیں کیسی ہیں تو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے عرض کیا کہ حضور ہم کو معلوم نہیں ہے آپ اگر بتا دیں تو البتہ معلوم ہو جائے گا آپ نے فرمایا جو کتاب میرے دائیں ہاتھ میں ہے یہ رب العالمین کی طرف سے ہے اس میں تمام اہل جنت کے نام اور ان کے باپوں کے اور

[1] ترمذی شریف باب ما جاء ان اللہ کتب کتابا لاھل الجنۃ [illegible]

ان کے قبیلوں کے نام لکھ کر سب کا جوڑ لگا دیا گیا ہے ان میں کمی بیشی ممکن نہیں ہے اور جو کتاب میرے بائیں ہاتھ میں ہے یہ رب العالمین کی طرف سے ہے اس میں تمام اہلِ نار کے نام اور ان کے باپوں کے اور ان کے قبیلوں کے نام لکھ کر سب کا جوڑ لگا دیا گیا ہے ان میں کمی بیشی ممکن نہیں ہے اور قرآن شریف میں بھی اس قسم کی آیتیں بہت سی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جنتیوں اور دوزخیوں کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے اس میں تغیر و تبدل ممکن نہیں ہے نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو (ان الذین کفروا سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون) سورہ بقر، ترجمہ بلاشبہ جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے ان کے حق میں خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہ لائیں گے یعنی جن کافروں کے متعلق ازلی فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہ ازلی کافر ہی رہیں گے آپ ان کو کتنا ہی ڈرائیں مگر وہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے (لقد حق القول علیٰ اکثرھم فھم لا یومنون) سورہ یٰسین ترجمہ: ان میں سے اکثر لوگوں پر (تقدیری) بات ثابت ہو چکی ہے سو یہ لوگ ہرگز ایمان نہ لاویں گے یعنی جن کے متعلق ازل میں یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہ دوزخ ہی میں جائیں گے وہ ہرگز ایمان نہیں لا سکتے (افمن حق علیہ کلمۃ العذاب افانت تنقذ من فی النار) سورہ زمر ترجمہ بھلا جس شخص پر عذاب کی (ازلی تقدیری) بات محقق ہو چکی تو کیا آپ ایسے شخص کو جو کہ (علم الٰہی میں) دوزخ میں ہے (موجبات نار سے) چھڑا سکتے ہیں) یعنی جو دوزخ میں جانے والے ہیں وہ کوشش سے بھی ضلالت سے نہ نکلیں گے۔

غرض انبیاء علیہم السلام کسی دوزخی کو جنتی نہیں بنا سکتے بلکہ جو لوگ ازلی فیصلہ میں دوزخی لکھے جا چکے ہیں وہ انبیاء علیہم السلام کے آنے پر بھی دوزخی ہی رہیں گے مثلاً اگر فرعون کے پاس بجائے موسیٰ علیہ السلام کے ہزار نبی بھی بھیج دیا جاتا تو وہ کافر ہی رہتا اور ایسا ہی ابوجہل کے پاس اگر ہزار نبی بھی آتے تو وہ کافر ہی رہتا۔

اعتراض: جب انبیاء علیہم السلام کے آنے سے کوئی دوزخی بھی جنتی نہیں بن سکتا اور نہ کوئی جنتی دوزخی بن سکتا ہے بلکہ جو دوزخی تھے وہ ان کے آنے کے بعد بھی دوزخی ہی رہتے ہیں اور جو جنتی تھے وہ جنتی ہی رہتے ہیں تو پھر ان کے آنے کا فائدہ ہی کیا ہوا، بلکہ ان کا آنا تو عبث رہا تو پھر اس سلسلہ کو خداوند تعالیٰ نے جاری ہی کیوں کیا ہے عبث سلسلہ جاری کرنا ان کی شان کے خلاف ہے۔

الزامی جواب: ہر شخص کا یہ اعتقاد ہے کہ جس مریض کی قسمت میں شفا لکھی ہوتی ہے حکیم یا ڈاکٹر کے

علاج سے اس کو شفا ہو گی اور جس مریض کی قسمت میں شفا نہیں لکھی ہوتی اس کو تمام دنیا کے حکیم و ڈاکٹر مل کر بھی شفا نہیں دے سکتے، غرض کوئی حکیم یا ڈاکٹر کسی ایسے مریض کو جس کی قسمت میں شفا نہ ہو، شفا نہیں دے سکتا تو پھر طبیبوں اور ڈاکٹروں کا سلسلہ بھی بیکار و عبث رہا حالانکہ پھر بھی تمام دنیا کے عقلاء ان سے علاج کراتے ہیں تو جو جواب اس کا ہے وہی جواب سلسلۂ انبیاء علیہم السلام کا ہے جو روحانی ڈاکٹر و طبیب ہیں

تحقیقی جواب: عبث وہ فعل ہوتا ہے جس میں کوئی بھی فائدہ نہ ہو، انبیاء علیہم السلام اگرچہ کسی دوزخی کو جنتی نہیں بنا سکتے لیکن ان کے آنے میں دو فائدے ہیں، جس فعل میں ایک فائدہ بھی ہو تو وہ عبث نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ جس فعل میں دو بہت بڑے بڑے فائدے ہوں اس کو عبث کہا جائے۔

پہلا فائدہ یہ ہے کہ کافر دوزخ میں ڈالنے کے وقت خداوند تعالیٰ پر ظلم کا دھبہ نہیں لگا سکیں گے اور اگر بغیر بھیجے انبیاء علیہم السلام کے ان کو دوزخ میں ڈالا جاتا تو گو نفس الامر میں ظلم نہ ہوتا کیونکہ خداوند تعالیٰ کو بوجہ عالم الغیب ہونے کے پہلے ہی سے معلوم ہے کہ فلاں فلاں آدمی کافر ہی رہیں گے اگرچہ ان کے پاس ہزاروں نبی بھی بھیجے جائیں تو وہ ایمان نہیں لائیں گے لیکن ان لوگوں کو یہ موقع مل جائے گا کہ خداوند تعالیٰ پر ظلم کا دھبہ لگائیں اور یہ کہیں کہ ہم پر ظلم کیا جا رہا ہے کہ بغیر بھیجے کسی سمجھانے والے کے ہم کو دوزخ میں ڈالا جا رہا ہے ہماری کیا خطا ہے؟ اگر ہم کو کسی نبی کے ذریعہ سے سمجھاتے اور ہم نہ مانتے تو بیشک ہم کو دوزخ میں ڈالتے اسی فائدہ کے متعلق اس آیت میں اشارہ ہے رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ (سورہ نساء ترجمہ: ان سب کو خوشخبری دینے والے اور خوف سنانیوالے پیغمبر بنا کر اس لیے بھیجا تاکہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے ان پیغمبروں کے بعد کوئی عذر باقی نہ رہے اور اللہ تعالیٰ زور والے ہیں بڑی حکمت والے ہیں) خداوند تعالیٰ نے اس آیت سے پہلے چند انبیاء علیہم السلام کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کے بعد اس آیت میں ان کے بھیجنے کا فائدہ و حکمت بتائی ہے کہ ان تمام حضرات کو اس لیے بھیجا ہے کہ ان کے آنے کے بعد لوگوں کو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ پر بظاہر بھی ظلم کا دھبہ لگانے کا موقع نہ ملے، ورنہ قیامت کے روز یوں کہتے کہ ہماری کیا خطا ہے جو ہم کو دوزخ میں ڈالا جاتا ہے اور (وکان اللہ عزیزا حکیما) میں یہ ظاہر کر دیا ہے کہ گو میرا بغیر بھیجے رسولوں کے

سزا دینا بھی حقیقت میں ظلم نہ تھا کیونکہ میں مالک حقیقی ہونے میں منفرد ہوں مگر چونکہ میں حکیم بھی ہوں لہٰذا میری حکمت کا تقاضا یہی تھا کہ رسولوں کو بھیجکر ظاہری عذر کی جڑ کو بھی کاٹ دوں۔

غرض انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے سے مقصد دوزخیوں کو جنتی بنانا نہیں ہے تا کہ اس مقصد کے حاصل نہ ہونے کی وجہ سے ان کے آنے کو عبث قرار دیا جائے بلکہ ان کے آنے کا مقصد لوگوں کے عذر کی جڑ کو کاٹنا ہے۔

اگر لوگوں کی طرف سے اس عذر کا احتمال نہ ہوتا تو شاید رسولوں کے بھیجنے کی ضرورت نہ ہوتی جیسا کہ اس آیت میں ارشاد ہے ولولا ان تصیبهم مصیبة بما قدمت ایدیهم فیقولوا ربنا لولا ارسلت الینا رسولا فنتبع اٰیاتك ونكون من المؤمنین ه سورۂ قصص، ترجمہ: اور ہم رسول نہ بھی بھیجتے اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ان پر ان کے کرداروں کے سبب کوئی مصیبت نازل ہوتی تو یہ کہنے لگتے کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے ہمارے پاس کوئی بھی رسول نہ بھیجا تا کہ ہم آپ کے احکام کا اتباع کرنے اور ایمان لانے والوں میں ہوتے) غرض انبیاء علیہم السلام کی بعثت سے ایک فائدہ یہ ہے کہ کفار کو قیامت کے روز خداوند تعالےٰ پر ظلم کا دھبہ لگانے کا موقع نہیں ملے گا۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے فیضِ صحبت سے مراتب کمال جلدی اور آسانی کے ساتھ طے ہوتے ہیں جو کمال پچاس برس میں حاصل ہوتا وہ ان کی صحبت میں ایک برس بلکہ چند منٹوں میں حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اس فن کے پورے ماہر ہوتے ہیں اور تمام نشیب و فراز سے واقف لہٰذا بہت جلد راستہ طے کرا دیتے ہیں۔ الغرض ان کے ذریعہ سے ہدایت تو انہی لوگوں کو ہوگی جن کی قسمت میں ہے کسی بدبخت ازلی کو راہِ راست پر نہیں لا سکتے لیکن جن لوگوں کی قسمت میں ہدایت ہے ان کو بہت جلد کمال تک پہنچا دیتے ہیں اگر وہ لوگ ان کی صحبت میں نہ آتے تو بہت دیر میں کمال کو پہنچتے۔ جیسا کہ طبیب و ڈاکٹر کے علاج سے تو وہی اچھا ہوگا جس کی قسمت میں شفا لکھی ہوئی ہے لیکن ڈاکٹر و طبیب کا کمال صرف اتنا ہی ہے کہ جو مرض ان کے علاج کے بغیر ایک مہینہ میں جاتا وہ ان کے علاج سے ایک ہفتہ میں جائے گا کیا یہ کوئی معمولی فائدہ ہے۔

مثلاً ایک شخص مکان پر جانا چاہتا ہے اور اس کا مکان ایک ہزار میل کے فاصلہ پر ہے پیدل جائے

جب بھی وہیں جائے گا اور ریل پر جائے جب بھی وہیں لیکن اگر پیدل جائے تو کم از کم دو مہینے میں پہنچے گا وہ بھی بڑی تکلیف اٹھاکر اور اگر ریل پر جائے تو دو دن میں پہنچے گا نہایت آسانی کے ساتھ تو کیا ریل کا یہ کوئی معمولی کمال ہے، ہرگز نہیں بلکہ بہت بڑا کمال ہے کہ دو مہینے کی مصیبت سے بچاکر نہایت آسانی کے ساتھ دو دن میں منزلِ مقصود تک پہنچا دیا کیا کوئی ریل کو عبث کہہ سکتا ہے، ایسا ہی انبیاء علیہم السلام کا کمال یہی ہے کہ وہ بہت بڑے لمبے راستے کو جلد اور آسانی کے ساتھ طے کرا کر منزلِ مقصود تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس نے اسلام سے مشرف ہوکر صرف چند منٹ بھی صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاصل کی ہے جس کی وجہ سے وہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی فہرست میں داخل ہوگیا، کوئی شخص بعد میں آنے والوں میں سے اس ادنیٰ درجہ کے صحابی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا، خواہ کتنا ہی عبادت گذار کیوں نہ ہو، یہی مطلب ہے، مولانا روم صاحب کے اس شعر کا ؎ یک زمانہ صحبت با اولیاء ، بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا ، یعنی جو کمال علیحدہ رہکر برسوں میں حاصل ہوتا ہے وہ ایک کامل مرشد کی صحبت میں منٹوں میں حاصل ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام سے بڑھکر کوئی کامل دنیا میں نہیں آسکتا لہٰذا ان کی صحبت و تعلیم سے سینکڑوں برسوں کا راستہ منٹوں میں طے ہوتا ہے الحاصل انبیاء علیہم السلام کی بعثت سے دو فائدے ہوتے ہیں ایک کفار کے عذر کو رفع کرنا تاکہ خداوند تعالیٰ پر ظلم کا دھبہ نہ لگا سکیں دوسرا طالبانِ ہدایت کو بہت جلد کمال تک پہنچانا۔

تو اب ان دو فائدوں کے ہوتے ہوئے سلسلۂ انبیاء علیہم السلام پر عبث ہونیکا الزام لگانا سراسر نادانی ہوگی۔

پیغمبروں کا جان سے زیادہ محبوب ہونا

انسان کے لیے خداوند تعالیٰ کی رضا سے بڑھکر کوئی چیز محبوب نہیں ہوسکتی کیونکہ عاشق کی نظر میں محبوب کی رضا سے بڑھکر کوئی چیز نہیں ہوا کرتی حتیٰ کہ اپنی جان سے بھی محبوب کی رضا کو زیادہ محبوب سمجھتا ہے اس لیے اس کی رضا میں اپنی جان کو بھی قربان کردیتا ہے، یہ بات تو مجازی محبوبوں کے عاشقوں میں بھی موجود ہے تو بھلا عاشقانِ محبوبِ حقیقی کے نزدیک رضائے محبوب سے بڑھکر کیا چیز ہوگی ایک جان نہیں بلکہ ہزار جانوں کو بھی اس کی رضا پر قربان کردیں اسلیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا جی یہ چاہتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی راہ میں قربان ہو جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قربان ہوجاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قربان ہوجاؤں۔

چونکہ اس رضا کے حصول کا ذریعہ فقط انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں لہٰذا وہ بھی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہونے چاہئیں حتیٰ کہ جان سے بھی، اسلئے کہ جو مقصد دیگر مقاصد سے زیادہ محبوب ہو اس کا ذریعہ بھی باقی مقاصد کے ذرائع سے زیادہ محبوب ہوتا ہے، جب رضائے مولیٰ جان سے زیادہ محبوب ہے تو اس کا ذریعہ بھی جان سے زیادہ محبوب ہونا چاہیئے، مجنون سے پوچھیے کہ جو شخص لیلیٰ کے وصل کا ذریعہ ہو وہ اسکے نزدیک کسقدر محبوب ہوگا انبیاء علیہم السلام چونکہ محبوب حقیقی کے وصل کا واحد ذریعہ ہوتے ہیں لہٰذا وہ جان سے بھی زیادہ محبوب ہونے چاہئیں۔

جس قدر مصائب انسان پر مرنیکے بعد آنیوالے ہیں وہ دنیاوی مصائب سے بدرجہا زیادہ اور سخت ہیں ان سے بچنے کا ذریعہ بھی انبیاء علیہم السلام کے سوا دوسرا نہیں ہے، کوئی حکیم یا ڈاکٹر نہیں بتا سکتا کہ قبر کا اندھیرا دور کرنے کا کیا علاج ہوگا یا اسکی تنگی کیونکر رفع ہوگی یا وحشت سے بچنے کا کیا ذریعہ ہوگا یا میدانِ حشر میں آفتاب کی گرمی کیونکر جائیگی یا پلصراط سے گزرنے کیلئے سواری کیونکر میسر ہوگی، مگر انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں یہ کمال ہے کہ ہزارہا سال پہلے ان تمام مصائب سے بچنے کا علاج بتا دیتے ہیں اور پھر ان کے علاج میں خوبی یہ ہوتی ہے کہ نہایت ہی آسان و سستا ہوتا ہے تو اس اعتبار سے بھی انبیاء علیہم السلام تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہونے چاہئیں، الحاصل جلب منافع و دفع مضار دونوں کے اعتبار سے انبیاء علیہم السلام کا وجود اقدس تمام اشیاء سے زیادہ محبوب ہونا چاہیئے۔

اسی کے متعلق ارشاد ہے اس آیت میں (النبی اولیٰ بالمومنین من انفسہم) سورۂ احزاب، ترجمہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایمان والوں کے ساتھ خود ان کے نفس (اور ذات) سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں کیونکہ اگر نفس برا ہے تب تو ظاہر ہے کہ وہ بدخواہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم خیر خواہ ہیں اور اگر نفس اچھا ہے تب بھی بعض مصالح اور منافع اس سے مخفی رہتے ہیں، ان مصالح کا مشورہ نفس نہیں دے سکتا۔ خصوصاً مصالح دنیویہ واخرویہ میں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خداوند تعالیٰ نے جمیع مصالح ضروریہ کا علم عطا فرمایا ہے اور آپ نے ان کی تعلیم فرمائی ہے، بہرحال آپ سے نفع ہی نفع ہے اور پھر ہر قسم کا نفع ہے اسلیے آپ کا اپنی جان سے بھی زیادہ حق ہے اور آپ اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہونے چاہئیں اسی لیے فرمایا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کوئی تم میں سے مومن نہیں ہوگا جب تک اس کو میری محبت اپنے

باپ اور ماں اور اولاد اور اپنی جان اور سب لوگوں سے زیادہ نہ ہو۔

پیغمبروں کی تصدیق کا جزوِ ایمان ہونا

جب یہ بات واضح ہو چکی کہ خداوند تعالےٰ کی رضا جوئی انسان کا اہم ترین فریضہ ہے، تو حسبِ قاعدہ (مقدمہ واجب کا واجب ہوتا ہے) جن چیزوں پر خداوند تعالےٰ کی رضا کا حصول موقوف ہو گا ان سب کی تصدیق جزوِ ایمان ہو گا، اور وہ تین چیزیں ہیں انبیاء علیہم السلام، ملائکہ آسمانی کتابیں، کیونکہ آسمانی کتابیں تو اللہ کی رضا جوئی کا مفصّل قانون ہوتی ہیں جو مقصود بالذات ہے، لہٰذا ان پر ایمان لانا فرض ہو گا اور کتابوں کا حصول موقوف ہوتا ہے انبیاء علیہم السلام پر لہٰذا ان پر بھی ایمان لانا ضروری ہو گا اور انبیاء علیہم السلام کے پاس کتابوں کا آنا موقوف ہے سلسلۂ ملائکہ پر لہٰذا ان پر بھی ایمان لانا لازمی ہو گا، الغرض ملائکہ انبیاء علیہم السلام آسمانی کتابیں، تینوں چیزیں موقوف علیہ ہیں خداوند تعالےٰ کی رضا جوئی کا لہٰذا ان تینوں کی تصدیق جزوِ ایمان ہو گا۔

اور رضا حاصل کرنے نہ کرنے کی جزاوسزا کے لیے چونکہ قیامت کا دن مقرر ہے لہٰذا اس کی تصدیق بھی جزوِ ایمان ہو گا اور قیامت کے دن جزاوسزا کا دینا موقوف ہے مرنے کے بعد دوبارہ جلانے پر، لہٰذا مرنے کے بعد دوبارہ جلانے پر ایمان لانا بھی جزوِ ایمان ہو گا۔

الحاصل ملائکہ، انبیاء علیہم السلام آسمانی کتابیں، مرنے کے بعد دوبارہ جلانا، قیامت کا دن ان سب پر ایمان لانا فرض ہو گا، کوئی شخص جب تک ان سب پر ایمان نہ لائے ہرگز مومن نہیں ہو گا اور نہ رضائے مولیٰ حاصل کر سکے گا جو اہم ترین فریضۂ انسان ہے بلکہ خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہو گا۔

حصّہ اوّل ختم شد، الحمد للہ رب العالمین

تاریخ طبع دوم، جمادی الاوّل، ۱۴۰۵ھ ہجری

حصہ دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علیٰ افضل الرسل والنبیین وعلیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین اما بعد! ابتدا سے لے کر اب تک تو بحث تھی مطلق نبوّت کے متعلق جو تمام انبیاء علیہم السلام میں مشترک ہے لیکن اب خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے متعلق گفتگو شروع ہوتی ہے۔ آپ کی نبوت کے متعلق چند بحثیں ایسی ہیں جن کا ذکر کرنا اور ان کو دلائل سے واضح کرنا ضروری ہے، مخالفین اسلام کو ان بحثوں کے متعلق طرح طرح کے شکوک وخدشات پیش آتے ہیں لہٰذا ان بحثوں پر اس قدر روشنی ڈالنی ضروری ہے کہ سمجھدار وانصاف پرست کا اطمینان ہو جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام پیغمبروں سے افضل ہونا

اہلِ اسلام کے نزدیک تمام انبیاء علیہم السلام کی محبت اور ان کی نبوت کا اعتقاد جزوِ ایمان ہے کسی ایک نبی کے منکر کو بھی کافر سمجھتے ہیں لیکن خاص کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل و اعلیٰ اور سب کا سردار سمجھتے ہیں اور یہ ان کا مجرد دعوٰی ہی نہیں بلکہ ان کے پاس اس کے دلائل عقلیہ ونقلیہ دونوں طرح کے موجود ہیں لیکن قبل اس کے کہ میں دلائل کو ذکر کروں مناسب سمجھتا ہوں کہ پہلے یہ بتا دوں کہ افضلیت کے معنی کیا ہیں؟ کیونکہ بہت سے لوگوں کو اس میں بھی خلط واقع ہوا ہے جس کی وجہ سے غلط نتائج پر پہنچے ہیں۔

افضلیت کے معنی کی تشریح

اہلِ اسلام کے نزدیک جو معنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افضل الانبیاء ہونے کے ہیں ان کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اکثر لوگوں نے آپ کی افضلیت کا انکار کر دیا ہے اور

اپنی طرف سے غلط معیار قائم کرکے دیگر انبیاء علیہم السلام کے افضل ہونے کا دعویٰ کیا ہے کسی نے تو یہ سمجھا کہ جس نبی کے معجزے بڑے ہیں وہ نبی بھی بڑا ہے۔ اس بنا پر نصاریٰ نے یہ دعویٰ کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہیں کیونکہ ان کے معجزے (یعنی مردوں کو زندہ کرنا اور مادر زاد اندھوں کو اچھا کرنا وغیرہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے سے بڑے ہیں، یہود نے یہ کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات بڑے ہیں لہٰذا وہ افضل ہیں، کسی نے یہ کہا کہ آدم علیہ السلام کو ملائکہ سے سجدہ کرایا گیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں کرایا، لہٰذا آدم علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہیں، غرض اسی طرح لوگوں نے مختلف معیار اپنی طرف سے قائم کیے مگر یہ تمام باتیں افضلیت کا صحیح معیار نہ سمجھنے کی وجہ سے تھیں۔

معجزات کی جو تحقیق اوپر گذر چکی ہے اس کے سمجھ لینے کے بعد ہر شخص نہایت آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ معجزات کو افضلیت کا معیار ٹھہرانا صحیح نہیں ہے لیکن اگر کوئی معاند اپنے عناد سے باز نہ آئے اور معجزات ہی کو معیارِ افضلیت قرار دینے پر اصرار کرے تو عنقریب اللہ نے چاہا تو یہ مرحلہ بھی طے کر دیا جائے گا کہ کس نبی کے معجزات بڑے ہیں اور انشاء اللہ تعالیٰ آفتاب کی طرح روشن کر دیا جائے گا کہ کسی نبی کے معجزات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات سے بڑے نہیں تھے لیکن پہلے میں اس بات کو صاف کرنا چاہتا ہوں کہ اہل اسلام کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کے کیا معنی ہیں اور ان کے پاس اس دعویٰ کے دلائل عقلیہ یا نقلیہ کیا ہیں؟

اہل اسلام کے نزدیک نہ تو افضلیت کے یہ معنی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خوشخط زیادہ تھے اور نہ یہ معنی ہیں کہ آپ نے ساری عمر میں شادی نہیں کی اور نہ یہ معنی ہیں کہ آپ کو ملائکہ سے سجدہ کرایا گیا اور نہ یہ معنی ہیں کہ آپ کو زندہ آسمان پر اٹھایا گیا وغیرہ وغیرہ بلکہ افضلیت کے یہ معنی ہیں کہ منصب نبوت میں آپ تمام انبیاء علیہم السلام سے اعلیٰ و افضل تھے اور خداوند تعالیٰ

کے دربار میں تمام حضراتِ انبیاء علیہم السلام سے زیادہ مقرب تھے یعنی آپ کو نبوت کا اتنا بڑا منصب عطا کیا گیا کہ جس سے اوپر نبوت کا کوئی درجہ ہی باقی نہیں رہا اور تمام انبیاء علیہم السلام منصبِ نبوت میں آپ کے ماتحت اور آپؐ سے کم درجہ کے تھے اور خداوند تعالےٰ کے دربار میں آپ کو قرب کا وہ درجہ عطا کیا گیا کہ اس سے اوپر قرب کا کوئی درجہ ہی باقی نہیں رہا اور تمام انبیاء علیہم السلام قربِ خداوندی میں آپؐ سے کم درجہ کے تھے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ جس طرح وزارت کے درجات میں وزیر اعظم کا درجہ سب سے بڑا ہوتا ہے وزارت کا کوئی درجہ اس سے اوپر نہیں ہوتا، تمام وزراء منصبِ وزارت میں اس کے ماتحت اور اس سے کم درجہ کے ہوتے ہیں، یا جس طرح حکومت کے درجات بادشاہ پر ختم ہو جاتے ہیں حکومت کا کوئی درجہ اس سے اوپر نہیں ہوتا، تمام حکام منصبِ حکومت میں اس کے ماتحت اور اس سے کم درجہ کے ہوتے ہیں، یا جس طرح درجاتِ روشنی میں آفتاب سب سے بڑا ہے روشنی کا کوئی درجہ اس سے اوپر نہیں ہے۔ تمام ستارے روشنی میں اس سے کم درجہ کے ہیں اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منصبِ نبوت و قربِ خداوندی میں وہ درجہ عطا ہوا ہے کہ اس سے اوپر کوئی درجہ نبوت و قرب کا باقی ہی نہیں رہا اور تمام انبیاء علیہم السلام درجہ نبوت و قرب میں آپ سے کم درجہ کے تھے، یہ ہیں معنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افضل الانبیاء ہونے کے اہلِ اسلام کے نزدیک، اس کے لیے چند باتیں قابلِ غور ہیں:

(الف) منصبِ نبوت ملنے کا دار و مدار چونکہ قربِ خداوندی پر ہے سوا مقربین کے یہ منصب دوسرے کو مل ہی نہیں سکتا چنانچہ ابتدا ہی میں اس کی تشریح کر دی گئی ہے، تو جس درجہ کا قرب ہوگا اسی درجہ کا منصب ملے گا۔ تو اب کسی نبی کو منصبِ نبوت سب سے بڑا ملنا اس بات کی صریح دلیل ہوگی کہ یہ نبی سب سے زیادہ مقرب تھا لہٰذا اگر ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منصبِ نبوت میں سب سے بڑا ہونا ثابت کر دیں گے تو آپؐ کا دربارِ خداوندی میں سب سے زیادہ مقرب ہونا ثابت ہو جائے گا۔ کسی دوسری دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

(ب) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منصبِ نبوت میں اعلیٰ و افضل ہونا دو وجہ سے ہے ایک

وجہ یہ کہ آپ کی شریعت کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ قیامت تک بدستور باقی رہے گی اور باقی انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں خاص خاص وقتوں کے ساتھ مخصوص تھیں، حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے پر سب منسوخ کردی گئیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کی شریعت ودعوت کسی خاص قوم یا ملک کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام دنیا کے جن وانسان کے لیے ہے اور باقی حضرات کی دعوت وشریعت خاص خاص قوموں کے لیے تھی۔

(ج) مذکورہ بالا دونوں وجہوں کو دو فصلوں میں بیان کیا جائے گا پہلے آپ کی دعوت وشریعت کا تمام دنیا کے لیے عام ہونا ثابت کیا جائے گا، بعدہٗ آپ کی شریعت کا قیامت تک باقی رہنا ثابت کیا جائے گا۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا عام ہونا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ودعوت عام ہونے کے دلائل دو طرح کے ہیں، عقلیہ ونقلیہ پہلے دلائلِ نقلیہ کو ذکر کرتا ہوں اس کے بعد دلائل عقلیہ پیش کروں گا۔

دلائل نقلیہ

(۱) وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ سورہ سبا، ترجمہ: ہم نے تو آپ کو تمام لوگوں کے واسطے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے) لفظ ناس اطلاق عرفی میں جن کو بھی شامل ہے۔

(۲) تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ○ سورۂ فرقان، ترجمہ: بڑی عالیشان ذات ہے جس نے یہ فیصلہ کی کتاب (یعنی قرآن شریف) اپنے بندۂ خاص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرمائی تاکہ وہ تمام دنیا جہان والوں (یعنی انسان وجن سب) کے لیے ڈرانے والا ہو۔

(۳) اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ سورہ تکویر، ترجمہ: بس یہ (یعنی قرآن شریف) دنیا جہان والوں کے لیے ایک بڑا نصیحت نامہ ہے)

(۴) قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ سورۂ اعراف، ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ اے (دنیا جہان کے) لوگو میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں جس کی بادشاہی ہے تمام آسمانوں اور زمین میں) لفظ ناس اطلاق عرفی میں جن کو بھی شامل ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔

(۵) هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ سورہ صف، ترجمہ: وہ اللہ ایسا ہے جس نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہدایت (یعنی قرآن شریف) اور سچا دین (یعنی اسلام) دے کر بھیجا ہے تاکہ اس (دین) کو تمام دینوں پر غالب کر دے گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔

ان مذکورہ بالا آیات میں آپ کی دعوت و شریعت عام ہونے کی تصریح ہے آیات تو اور بھی ہیں لیکن اختصاراً ان کو ذکر نہیں کیا گیا۔

(۶) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم وکان النبی یبعث الی قومہ خاصّۃً وبعثت الی الناس کافّۃً) بخاری باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم جعلت لی الارض مسجداً وطھوراً ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (مجھ سے پہلے) نبی کو خاص اسی کی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں سب دنیا کے لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں) احادیث تو اور بھی اس مضمون کی بہت ہیں لیکن مذکورہ بالا آیاتِ صریحہ کے ہوتے ہوئے زیادہ احادیث کے ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

دلائلِ عقلیہ

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا نبی ہونا دلائل و معجزات سے ثابت ہے خصوصاً قرآن شریف ایک ایسا معجزہ ہے آپؐ کی صداقت کا جس کا جواب نہ آج تک ہوا ہے اور نہ قیامت تک ہو گا جس کی تشریح کسی قدر معجزات کے بیان میں گذر چکی ہے اور مزید تشریح آگے آئے گی، اور حضرات اہلِ کتاب بھی آپ کو نبی تسلیم کر چکے ہیں کیونکہ وہ فقط آپ کو عرب کے لیے نبی مانتے تھے

گو عموم دعوت کے منکر تھے۔

اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ نبی جھوٹ نہیں بول سکتا کیونکہ جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے اور انبیاء علیہم السلام معصوم گناہوں سے پاک ہوتے ہیں جس کی تشریح ابتداء ہی میں گذر چکی ہے پس جب آپ کا نبی ہونا ثابت ہے تو جو کچھ آپ زبانِ مبارک سے فرمائیں گے وہ سب سچ ہوگا اور آپ نے اپنی زبان مبارک سے یہ دعویٰ کیا ہے کہ میری شریعت و دعوت عام ہے تمام دنیا جہان والوں کے لیے جس کی تشریح آیات واحادیث میں اوپر گذر چکی ہے پس ماننا پڑے گا کہ آپ تمام دنیا کے لیے نبی ہیں۔

دیگر انبیاء علیہم السلام کی نبوت چونکہ عام نہیں تھی لہٰذا ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ ہی نہیں کیا کہ میں ساری دنیا کے لیے نبی ہوں۔

الحاصل اگر کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت میں شک ہو تو ہم سے رفع کرلے مگر اس ثبوت کے بعد آپ کی نبوت کے عام ہونے کی دلیل کی حاجت نہیں ہوگی، بلکہ آپ کا فرما دینا ہی کافی ہوگا۔

(۲) اثباتِ دعویٰ کے لیے جس قدر دلائل پیش کیے جاتے ہیں ان سب سے زیادہ واضح مشاہدہ ہے مشاہدہ سے بڑھکر کوئی دلیل واضح نہیں ہوتی اور مذہب اسلام عالمگیر ہونے کا ہر شخص مشاہدہ کرسکتا ہے کونسا ایسا ملک ہے جس میں اسلام کے شیدائی نہ ملتے ہوں،

جو لوگ اپنے مذہب کو قدیم بتاتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارا مذہب اسلام سے لاکھوں برس پہلے سے چلا آرہا ہے وہ نظر انصاف سے دیکھیں کہ ان کے مذہب نے باوجود قدیم ہونے کے کس قدر وسعت حاصل کی ہے اور اسلام جس کو دنیا میں آئے ہوئے ابھی چودہ سو سال بھی پورے نہیں ہوئے اس کی وسعت کہاں تک پہنچ گئی ہے اگر پہاڑوں کی غاروں کو جا کر دیکھیں تو وہاں سے بھی اسلام کی صدا کان میں آئے گی اور اگر جنگلوں کو جا کر ٹٹولیں تو جھاڑیاں بوٹیاں بھی اسلام کا پتہ بتائیں گی غرض کوئی کونہ زمین کا ایسا نہیں ملے گا جس میں اسلام کی آواز نہ آئے۔

الحاصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا عام ہونا اس وقت آفتاب کی طرح روشن ہے ہر شخص

مشاہدہ کر سکتا ہے کوئی مذہب دنیا بھر میں اس قدر وسعت نہیں حاصل کر سکا اور نہ کر سکے گا، اگر اسلام میں عام ہونے کی صلاحیت نہ ہوتی تو اس قدر جلدی اتنی وسعت ہر گز حاصل نہ کر سکتا جیسا کہ دیگر مذاہب نہیں کر سکے کیونکہ ان میں عام ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہے جیسا کہ تیسری دلیل سے واضح ہو جائیگا۔

(۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے قوانین کی وضع میں غور کرنے سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ شریعت عالمگیر شریعت ہے کیونکہ ہر ہر قانون میں تمام دنیا کی قوموں کی مصلحت کو مدِّنظر رکھا گیا ہے اگر کسی دوسرے مذہب والے یہ دعویٰ کریں کہ ہمارا مذہب تمام دنیا کے لیے ہے تو اوّلاً تو یہ دعویٰ مشاہدہ کے خلاف ہے اور ثانیاً جب اس مذہب کے قوانین پر نظر ڈالی جائے گی تو یہ دعویٰ غلط ثابت ہوگا کیونکہ اس مذہب کے قوانین میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہوگی کہ تمام قوموں کی مصلحت کو پورا کر سکیں۔

قوانین میں غور کرنے کے بعد کوئی مذہب سوا اسلام کے ایسا نظر نہیں آئے گا کہ جس کے قوانین میں تمام دنیا کی قوموں کی مصلحت کا لحاظ رکھا گیا ہو، لہٰذا تمام دنیا کو دعوت دینے کا حق مذہبِ اسلام ہی کو حاصل ہے۔

گو اس رسالہ کا موضوع قوانین کی تشریح نہیں ہے بلکہ صرف مسئلہ رسالت کو واضح کرنے کے لیے لکھا گیا ہے لیکن نمونہ کے طور پر چند قوانین کو پیش کرتا ہوں۔

الرّسالۃ اوّل تو اسی مسئلہ میں غور فرمائیے جو موضوع ہے اس رسالہ کا (یعنی مسئلہ رسالت) کہ اس میں کس خوبی کے ساتھ مصلحتِ عامہ کو مدِّنظر رکھا گیا ہے، عاقل آدمی ان تمام باتوں میں غور کرنے کے بعد جو مسئلہ رسالت کے متعلق اس رسالہ میں ذکر کی گئی ہیں نہایت آسانی کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ اصلاحِ عامہ کے لیے اس سے بہتر اور کوئی صورت رسالت کی نہیں ہو سکتی۔

چونکہ اس مسئلہ کے تمام پہلو اس رسالہ میں مفصل موجود ہیں لہٰذا اس کے متعلق زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔

انضباطِ اوقات، ہر شخص جانتا ہے کہ لین دین و عبادت و احکام میں انضباط اوقات کی ضرورت پڑتی ہے مثل حج و زکوٰۃ و روزۂ رمضان و عیدین و عدت و طلاق وغیرہ وغیرہ، اور انضباطِ

اوقات کی دو صورتیں ہیں، شمسی[1] حساب و قمری[2] حساب، لیکن شمسی حساب ہر شخص نہیں سمجھ سکتا بلکہ اس کے سمجھنے کے لیے ایک اچھے حساب دان کی ضرورت ہے اور انضباطِ اوقات کی ضرورت فقط حساب دانوں ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ ہر کس و ناکس کو پیش آتی ہے اور قمری حساب بالکل آسان ہے خواندہ و ناخواندہ اس کو برابر سمجھ سکتا ہے لہٰذا مذہب اسلام نے ہر قسم کے لوگوں کا لحاظ کرتے ہوئے قمری حساب کو اختیار کیا ہے اور احکام کا دارومدار اسی پر رکھا ہے تاکہ کسی شخص کو دقت نہ پیش آئے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھائی کہ ایک مہینہ تمام بیبیوں سے علیٰحدہ رہیں گے اور ایک بالاخانہ پر تشریف لے گئے انتیس[29] دن گذرنے کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس تشریف لائے تو حضرت عائشہ رض نے عرض کیا کہ آپ نے تو مہینہ بھر کی قسم کھائی تھی ابھی تو انتیس ہی دن ہوئے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا کہ اے عائشہ! ہم تو ایک بے لکھی پڑھی جماعت ہیں آپ نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو پھیلا کر تین دفعہ اشارہ کیا اور یہ اشارہ فرمایا کہ مہینہ کبھی تیس دن کا ہوتا ہے، اور دوبارہ پھر دونوں ہاتھوں سے تین دفعہ اشارہ کیا مگر تیسری دفعہ ایک انگلی نیچے کر لی اور فرمایا کہ مہینہ کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے اور آپ کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا حساب تو قمری مہینوں سے ہوتا ہے اور قمری مہینہ کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے اور کبھی تیس کا۔[1]

الحاصل انصاف سے دیکھنے والا تو قطعاً سمجھ سکتا ہے کہ مصلحتِ عامہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قمری حساب سے بہتر دوسری کوئی صورت نہیں ہو سکتی کیونکہ حساب کی ضرورت تو اس قدر عام ہے کہ عورتوں کو عدت گزارنے میں بھی ضرورت پڑتی ہے، تو اگر ان کو شمسی مہینوں کا حساب لگانا پڑے تو کس قدر دقت میں واقع ہوں گی حساب دانوں کی تلاش میں ماری ماری پھریں گی، لیکن قمری حساب سے گھر بیٹھے بٹھائے نہایت آسانی کے ساتھ عدت گزار لیں گی، اول تو خود ہی چاند کو دیکھ لیا کریں گی ورنہ بچہ بچہ بتا دیگا کہ آج چاند ہو گیا۔

غرض جس مذہب نے قمری حساب اختیار نہیں کیا اس کو انصاف کی رو سے دعوتِ عامہ کا حق ہرگز نہیں ہو سکتا اور اس مصلحتِ عامہ کے لیے خالق نے چاند میں گھٹنا اور بڑھنا ایسے واضح طریقہ پر

[illegible]

رکھا ہے کہ ہر شخص اس کو آسانی کے ساتھ معلوم کر سکے، اگر سورج کی طرح چاند بھی ہمیشہ یکساں رہتا تو پھر قمری حساب میں بھی شمسی کی طرح دقت ہوتی اسی حکمت کے متعلق ارشاد ہے اس آیت میں ۔ ۔ ۔ ۔

ویسئلونک عن الاھلۃ قل ھی مواقیت للناس والحج، سورہ بقرہ ترجمہ: آپ سے چاندوں کے (ہر مہینہ گھٹنے بڑھنے کی) حالت (اور اس میں جو فائدہ ہے اس فائدہ) کی تحقیقات کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ (فائدہ اس کا یہ ہے کہ) وہ چاند (اپنے اس گھٹنے بڑھنے کے اعتبار سے) آلہ شناختِ اوقات ہیں لوگوں کے لیے (یعنی ان معاملات وغیرہ کے لیے) اور حج کے لیے) ایسا ہی زکوٰۃ و روزہ وغیرہ کے لیے، غرض اللہ تعالےٰ نے چاند میں یہ گھٹنا بڑھنا اس حکمت کے لیے رکھا ہے کہ لوگوں کو اس کے ذریعہ سے حساب میں آسانی ہو۔

البلوغ، بعض لوگوں نے مرد و عورت کے بالغ ہونے کا دار و مدار ایک خاص عمر پر رکھا ہے جیسا کہ گورنمنٹ کے قانون میں مرد و عورت دونوں کے لیے دیوانی معاملات میں اٹھارہ سال مقرر کیے ہیں، اٹھارہ سال سے پہلے دونوں کو نابالغ قرار دیا جاتا ہے خواہ ایک ہی دن کم ہو لیکن شریعت اسلامیہ نے بلوغ کا دار و مدار کسی خاص عمر پر نہیں رکھا کیونکہ مذہب اسلام کسی خاص قوم کے لیے نہیں ہے بلکہ عالمگیر مذہب ہے اسلیے تمام دنیا کی قوموں کو مدّنظر رکھ کر قانون بنایا ہے اور تمام قوموں کو مدّنظر رکھتے ہوئے حدِ بلوغ کا دار و مدار کسی خاص عمر پر رکھنا غیر ممکن ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ تمام دنیا کے آدمی ایک عمر میں بالغ نہیں ہوتے بلکہ بسبب اختلاف آب و ہوا بعض ملکوں میں جلدی بالغ ہوتے ہیں اور بعض میں دیر میں، اور ایسا ہی ایک ملک کے رہنے والے بلکہ ایک شہر کے رہنے والے مدتِ بلوغ میں مختلف ہوتے ہیں، کوئی پہلے بالغ ہوتا ہے کوئی پیچھے کیونکہ خداوند تعالےٰ نے تمام آدمیوں کو مختلف مزاج پیدا کیا ہے اسی وجہ سے ایک شخص کی اولاد بھی بالغ ہونے میں عمر کی رُو سے متفق نہیں ہوتی اور علاوہ اختلاف مزاج و اختلاف آب و ہوا کے بعض اوقات اور وجوہ سے بھی فرق پڑ جاتا ہے، مثلاً امراء کی اولاد نسبتہً غرباء کی اولاد کے عموماً جلدی بالغ ہوتی ہے کیونکہ بوجہ آسودہ حال ہونے کے کھانے پینے کے سامان ان کو حسبِ منشا مل سکتے ہیں اور غرباء کو نہیں ملتے اور ایسا ہی

بعض اوقات بوجہ عارضہ بیماری کے بھی بعض آدمی کمزور رہ جاتے ہیں اس وجہ سے دیر میں بالغ ہوتے ہیں غرض مذکورہ بالا امور کو دیکھتے ہوئے غیر ممکن ہے کہ بلوغ کے لیے کوئی خاص عمر مقرر کی جاوے اسی وجہ سے شریعت اسلامیہ نے بلوغ کا دارومدار عمر پر نہیں رکھا بلکہ علامات پر رکھا ہے اور حکم دیا ہے کہ ان علامات میں سے کوئی ایک علامت جس مرد یا عورت میں پائی جاوے وہ بالغ ہے خواہ کسی عمر میں پائی جاوے البتہ اگر کسی مرد یا عورت میں علامات کا ظہور نہ ہو تو اس کے لیے پندرہ سال مقرر کر دیئے ہیں پندرہ سال کے بعد دونوں کو بالغ قرار دیا ہے اور یہ طریقہ نہایت ہی فطرت کے مطابق ہے اور تمام دنیا کے باشندوں کو جامع، کیونکہ اس میں کسی کی فطرت کو دبایا نہیں گیا، ایسا نہیں کیا گیا کہ کسی کی فطرت تو حد بلوغ تک پہنچ گئی ہو لیکن قانوناً اس کو نابالغ قرار دیا جائے، بلکہ ہر شخص کی فطرت کے مطابق قانون بنایا گیا ہے، غرض انصاف پرست کے نزدیک اس سے بہتر اور جامع کوئی دوسری صورت نہیں ہو سکتی۔

النکاح چونکہ مرد و عورت میں فطرۃً ایک دوسرے سے ملنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور دوسرا نسل انسانی کا بقا بھی ضروری ہے جو مرد و عورت کے ملنے ہی پر موقوف ہے لہٰذا ان کے ملاپ سے تو چارہ نہیں ہے لیکن مرد چونکہ فطرۃً غیور واقع ہوا ہے اس کی غیرت اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی کہ وہ کسی عورت میں اپنے ساتھ کسی دوسرے کو شریک دیکھ سکے، لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ایک عورت کو ایک ہی مرد کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے کسی دوسرے مرد کی شرکت اس میں نہ ہونے پائے ورنہ نظام عالم میں فساد برپا ہو جائے گا اور قتل و قتال کا بازار ہر وقت گرم رہے گا۔

مذکورہ بالا امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر مذہب و ملت میں مرد و عورت کے ملنے کا ایک خاص طریقہ مقرر کیا گیا ہے جس میں اس بات کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے کہ ایک عورت کو ایک ہی مرد کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے تاکہ فساد کا بھی اندیشہ نہ رہے اور دونوں کو فطرتی خواہش پورا کرنے کا موقع بھی مل جائے اور نسل انسانی کے بقا کا انتظام بھی ہو جائے اور ہر مذہب و ملت میں اسی طریقہ کا ایک نام مقرر کیا گیا ہے اور مذہب اسلام میں اس کا نام نکاح رکھا گیا ہے، اتنا قدر تو تمام

مذاہب میں مشترک ہے لیکن اس کے بعد مَیں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ مذہبِ اسلام میں قانونِ نکاح میں جس قدر تمام دنیا کی قوموں کی مصلحت کو مدِّنظر رکھ کر قانون بنایا ہے کسی دوسرے مذہب میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔

مذہبِ اسلام میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ قانون بنانے کے وقت تمام پہلو سامنے رکھ کر قانون بنایا جاتا ہے، جہاں جہاں کسی خرابی کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اس کی اصلاح بھی ساتھ ہی کردی جاتی ہے اور ہر ملک کے باشندوں کی حالت کا صحیح اندازہ لگاکر قانون بنایا جاتا ہے تاکہ کسی قوم یا کسی ملک کے باشندوں کو دقت نہ پیش آئے۔

قانونِ نکاح کے متعلق جس قدر تحقیقات اسلام نے کی ہے اس کے لیے تو ایک بہت بڑا دفتر بھی ناکافی ہے لیکن بطورِ نمونہ چند باتیں پیش کرتا ہوں تاکہ سمجھدار آدمی اس نتیجہ پر پہنچ سکے کہ تمام قوموں کو اپنی طرف دعوت دینا اسلام ہی کا خاصّہ ہے، یہ بات کسی دوسرے مذہب کی شان کے شایاں نہیں ہے۔

(۱) نسلِ انسانی کا بقا چونکہ ضروری ہے اس لیے اس کا ذریعہ نکاح قرار دیا گیا ہے جو نہایت ہی فطرتِ انسانی کے موافق ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ جو چیزیں اس مقصد کی تکمیل میں مانع واقع ہوتی ہیں ان کی روک تھام بھی کردی جائے اور وہ دو چیزیں ہیں ایک لواطت یعنی لڑکوں کے ساتھ بدفعلی کرنا یا عورت سے یہی معاملہ کرنا، دوسری زنا، لواطت میں تو نطفہ کا ضائع ہونا بالکل واضح ہے اور زنا میں گو نطفہ جاتا تو اسی محل میں ہے جہاں بچہ پیدا ہوتا ہے لیکن ہر شخص کو معلوم ہے کہ زانی و زانیہ دونوں ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ بچہ پیدا نہ ہونے پائے، اس قسم کی ادویہ استعمال کی جاتی ہیں کہ نطفہ ٹھہرنے ہی نہ پائے یا ٹھہر جانے کے بعد گر جائے، یہی وجہ ہے کہ رنڈیوں کے ہاں اولاد بہت ہی کم ہوتی ہے اور اگر بالفرض شاذ و نادر ہو بھی جائے تو نہایت ہی ردّی ہوتی ہے بوجہ ولد الزنا ہونے کے لوگوں کی نظروں میں حقیر و ذلیل ہوتی ہے۔ اور علاوہ اس کے زناکاری سے بے حیائی بھی پیدا ہوتی ہے حیا جاتی رہتی ہے

جو ایمان کا ایک شعبہ ہے اور بے حیائی ایک ایسا بُرا وصف ہے کہ جس کا بُرا ہونا ہر مذہب و ملت میں مسلم ہے، الحاصل زنا و لواطت مقصدِ نکاح کی تکمیل میں نقصان دہ اور بے حیائی کی بنیاد ہیں لہٰذا شریعتِ اسلامیہ نے ان دونوں کو قطعاً حرام قرار دیا ہے اور قرآن شریف میں ان دونوں کی مخالفت صاف طور پر موجود ہے، خصوصاً زنا کے متعلق تو ایک مفصل قانون ہے اور قرآن شریف میں دو جگہ اولاد کے قتل کرنے کی ممانعت کے ساتھ متصل زنا کی ممانعت کو ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد پھر قتلِ نفس کی حرمت بیان کی گئی ہے۔ غرض قتل ممنوع کی دو صورتوں کے درمیان زنا کی ممانعت کو ذکر کیا گیا ہے جس سے اشارۃً یہ بتانا ہے کہ زنا بھی قریب قریب قتلِ اولاد ہی کے برابر ہے کیونکہ قتل میں تو پیدا ہونے کے بعد اولاد کو ضائع کیا جاتا ہے اور زنا میں پیدا ہونے ہی نہیں پاتی جس کی تشریح اوپر گذر چکی ہے، بہر صورت ضائع ہونا دونوں صورتوں میں مشترک ہے۔

الحاصل زنا و لواطت چونکہ مقصدِ نکاح کو نقصان دہ ہیں لہٰذا ان دونوں کو شرعاً حرام قرار دیا گیا ہے۔

(۲) وصفِ حیا چونکہ ایک مرغوب خلق ہے جس کا مرغوب ہونا ہر مذہب و ملت میں مسلّم ہے۔ بے حیائی کو کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا، لیکن نکاح کی بعض صورتیں ایسی تھیں کہ ان میں حیا جاتی رہتی ہے بے حیائی پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً ماں بہن وغیرہ کے ساتھ نکاح کرنا، لہٰذا شرعاً ان صورتوں کو حرام قرار دیا گیا جن کی حرمت کی تفصیل آیت حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ الخ میں کی گئی ہے۔

(۳) نکاح کی بعض صورتیں ایسی بھی تھیں کہ جن سے صلہ رحمی کو نقصان پہنچتا تھا جو نہایت ہی قابل حفاظت چیز ہے، مثلاً دو بہنوں کا یا خالہ بھانجی کا یا پھوپھی بھتیجی کا ایک شخص کے نکاح میں جمع کرنا، کیونکہ بوجہ سوکن ہونے کے صلہ رحمی قائم نہیں رہے گی لہٰذا شریعت میں یہ صورتیں بھی حرام قرار دے دی گئیں جن کی حرمت کی تصریح آیت (وَاَنْ تَجْمَعُوا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ) میں کر دی گئی ہے۔

(۴) عورت مرد کا معاملہ نکاح میں براہِ راست گفتگو کرنا چونکہ عورت کے وارثوں کے لیے باعثِ عار تھا اور اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ عورت چونکہ فطرۃً ناقص العقل ہے اس وجہ سے اپنی مصلحت کو بھی پورے طور سے نہ سمجھ سکے لہٰذا ان دونوں باتوں کے تدارک کے لیے شریعت

نے ولایت کو تجویز کیا ہے تاکہ یہ معاملہ عورت کے اولیاء کے ساتھ طے کیا جائے۔

(۵) خداوند تعالیٰ نے انسانوں کو چونکہ مختلف مزاج پیدا کیا ہے لہٰذا نکاح ہونے کے بعد بسا اوقات زوجین یعنی میاں بیوی کے درمیان موافقت نہیں پیدا ہوتی اور دونوں ایک دوسرے سے بیزار ہو جاتے ہیں مل کر زندگانی نہیں بسر کر سکتے۔

اگر نکاح کے بعد اس قسم کی صورتوں میں تفریق کی کوئی صورت تجویز نہ کی جائے تو دونوں کی زندگی برباد ہو جائے گی اور اس قسم کی صورتیں کثرت سے پیش آتی ہیں۔

اس قسم کی صورتوں کو مدِّ نظر رکھ کر شریعتِ اسلامیہ میں طلاق تجویز کی گئی ہے جس مذہب میں اس قسم کی صورتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور طلاق کو تجویز نہیں کیا گیا وہ مذہب انسانی اصلاح کا کیا دعویٰ کر سکتا ہے یہ اسلام ہی کا کمال ہے کہ کوئی پہلو بھی اصلاح کا باقی نہیں چھوڑا۔

مخالفین اسلام مسئلہ طلاق پر مذاق اُڑایا کرتے تھے لیکن تجربہ کے بعد مجبوراً ان کو طلاق کے متعلق قانون بنانا پڑا اور اپنے مذہب کو ناقص تسلیم کرنا پڑا، بیوہ کے نکاح کو جو لوگ ناجائز سمجھتے تھے وہ آج اسلامی قانون کے آگے سرِ تسلیم خم کر رہے ہیں مگر قربان جائیے مذہب اسلام پر کہ اس نے کوئی پہلو اصلاح کا باقی ہی نہیں چھوڑا، طلاق کا دینا چونکہ مرد کے اختیار میں ہے اسلیے ممکن ہے کہ وہ طلاق نہ دے، مگر عورت اس کے ساتھ رہنا برداشت نہیں کر سکتی تو اس کے لیے شریعت میں خلع تجویز کیا گیا ہے کہ عورت کچھ مرد کو دے کر اپنی رہائی کی صورت کر لے، اور اگر نکاح زمانۂ نابالغی میں ہوا تھا تو اس صورت میں عورت کے لیے خیارِ بلوغ بھی رکھا گیا ہے بالغ ہوتے ہی اگر چاہے تو نکاح فسخ کرا لے۔ البتہ باپ دادا کا کیا ہوا نکاح مذہب احناف میں فسخ نہیں کرا سکتی اور علاوہ احناف کے بعض حضرات کے نزدیک باپ دادا کا کیا ہوا نکاح بھی فسخ کرا سکتی ہے۔

غرض نااتفاقی کی صورت میں مرد و عورت دونوں کے لیے موقعہ تجویز کیا گیا ہے۔

الحاصل قانون نکاح کے متعلق اور بھی بہت سی باتیں ہیں لیکن یہ مختصر رسالہ ان کے ذکر کی گنجائش نہیں رکھتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مذہبِ اسلام کے قوانین کی وضع میں غور کرنے کے بعد آفتاب کی طرح روشن ہوجاتا ہے کہ یہ مذہب واقعی عالمگیر مذہب ہے، مذہبِ اسلام کے سارے ہی قوانین ایسے ہیں کہ ان میں مصلحتِ عامّہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے، صرف نمونہ کے طور پر چند مثالیں ذکر کی گئیں ہیں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے اور اسی طریقہ پر قوانین کی وضع قطعی دلیل ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت و دعوت عام ہونے کی، پس آپؐ کی شریعت کا عام ہونا دلائل عقلیہ و نقلیہ دونوں سے ثابت ہوا، باقی رہا افضلیت کی دوسری وجہ کا ثبوت یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا قیامت تک باقی رہنا تو یہ موقوف ہے ختمِ نبوّت کے مسئلہ پر اگر یہ ثابت ہوجائے کہ آپؐ خاتم النبیین ہیں آپؐ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا، تو ثابت ہوجائے گا کہ آپ کی شریعت قیامت تک باقی رہے گی کیونکہ کوئی شریعت منسوخ نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کے بجائے دوسری شریعت نہ بھیجی جائے اور شریعت نبی ہی کے ذریعہ سے بھیجی جاتی ہے تو جب آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا تو کوئی شریعت بھی نہیں آسکتی، پس آپ کی شریعت باقی رہے گی، غرض چونکہ یہ وجہ افضیلت کی ختمِ نبوت کے مسئلہ پر موقوف ہے لہٰذا پہلے اس مسئلہ کو صاف کرنا ضروری ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم الانبیاء ہونا

اہلِ اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں آپؐ کے بعد قیامت تک کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا اور اس دعوٰی پر ان کے پاس دلائل عقلیہ و نقلیہ دونوں طرح کے موجود ہیں، اول دلائلِ نقلیہ کو ذکر کرتا ہوں اسکے بعد دلائل عقلیہ کو پیش کروں گا۔

دلائلِ نقلیہ

(۱) مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا۔ سورۂ احزاب، ترجمہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن آپ اللہ کے رسول ہیں اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں اور اللہ تعالٰے ہر چیز کو خوب جانتا ہے) ختم کے لغوی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کو اس طرح بند کرنا کہ نہ

اس کے اندر کی چیز باہر نکل سکے اور نہ باہر کی چیز اس کے اندر جا سکے، اسی سے اس کے دوسرے معنی کسی شئے کو بند کر کے اس پر مہر کرنے کے ہیں جو اس بات کی علامت ہے کہ اس کے اندر سے نہ کوئی چیز باہر نکلی ہے اور نہ کوئی باہر کی چیز اس کے اندر گئی ہے، اور چونکہ یہ عمل مہر سب سے آخر میں کیا جاتا ہے اسلیے اس کے معنی انتہا، اور ختم کرنے کے بھی آتے ہیں، قرآن مجید میں یہ تمام معنی مستعمل ہوئے ہیں (الیوم نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ) سورہ یٰسٓ، آج ہم (قیامت کے دن) ان کے موہنوں پر مہر لگا دیں گے کہ بول نہ سکیں۔ اس آیت میں بند کر دینے کے معنی بالکل ظاہر ہیں، (خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ) سورہ بقر، خداوند تعالےٰ نے ان (کافروں) کے دلوں پر مہر لگا دی ہے یعنی نصیحت و ہدایت دلوں کے اندر نہیں جاتی اور کفر جو لوگوں کے اندر ہے وہ باہر نہیں آتا (وختم علیٰ سمعه وقلبه) سورہ جاثیہ۔ خداوند تعالےٰ نے اس کے کان پر اور دل پر مہر لگا دی ہے یعنی کان میں دعوت کی آواز اور دل میں آواز کا اثر نہیں جاتے، (یسقون من رحیق مختوم خِتَامُهٗ مِسْكٌ) سورہ تطفیف، ان (اہل جنت) کو پینے کے لیے وہ شراب خالص دی جائے گی جس پر مہر لگی ہوگی، اس کی مہر مشک ہوگی،) وہ سربمہر ہوگی یعنی بند ہوگی جو اس بات کا ثبوت ہوگا کہ یہ خالص شراب ہے یہ کھلی نہیں ہے کہ اس کے اندر کی خوشبو باہر نکل گئی ہو اور نہ کسی نے باہر سے کوئی چیز اس کے اندر ملا دی ہے جس سے اس کی تیزی کم ہو گئی ہو اور اس شراب کی بوتل یا صراحی کا منہ نہایت صفائی اور نزاکت کی غرض سے دنیا کی طرح مٹی یا لاکھ یا موم کے بجائے مشک خالص سے بند ہوگا۔

الحاصل ان تمام استعمالات سے صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ اس لفظ کے عمومی اور مشترک معنی کسی چیز کو بند کرنے کے ہیں۔

لفظ (خاتم) کی دو قرأتیں ہیں، مشہور قرأت بالکسر ہے جس کے معنی ختم کرنے والے اور بند کرنے والے کے ہوئے، اور دوسری قرأت بالفتح کی ہے جس کے معنی ہیں وہ شئے جس کے ذریعہ سے کوئی شئے بند کی جائے اور اس پر مہر لگائی جائے تاکہ وہ کھولی نہ جا سکے۔ اور نہ اس کے

اندر کوئی چیز باہر سے جا سکے۔

الحاصل دونوں حالتوں میں آیت کا حاصل معنی ایک ہی ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اقدس پیغمبروں کے سلسلہ کو بند کرنے والا اور ان پر مہر لگا دینے والا ہے کہ پھر آئندہ کوئی نیا شخص پیغمبروں کی جماعت میں داخل نہ ہو سکے، پس اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص مرزا صاحب ہوں یا کوئی دوسرا پیغمبروں کی جماعت میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتا۔

(۲) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو کان بعدی نبی لکان عمر بن الخطاب (ترمذی باب مناقب عمر، ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میرے بعد کوئی نبی ہو سکتا تو البتہ وہ عمر ہوتا) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اس فرمان سے یہ ہے کہ میرے بعد سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا گیا ہے، اگر میرے بعد نبوت ختم نہ ہوتی تو عمر ضرور نبی ہوتا۔

(۳) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وانہ سیکون فی امتی ثلاثون کذابون کلھم یزعم انہ نبی وانا خاتم النبیین لا نبی بعدی (ترمذی باب ماجاء لا تقوم الساعۃ حتی یخرج کذابون) ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت سے پہلے میری امت میں تیس کذاب ہوں گے ہر ایک دعویٰ نبوت کرے گا حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

(۴) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتا فاحسنہ واجملہ الا موضع لبنۃ من زاویۃ فجعل الناس یطوفون بہ ویتعجبون لہ ویقولون ھلا وضعت ھذہ اللبنۃ قال فانا اللبنۃ وانا خاتم النبیین (بخاری باب خاتم النبیین)[۱۵] ترجمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اور میرے سے پہلے نبیوں کی مثال ایسی ہے جیسا ایک شخص نے گھر بنایا اور اس کو نہایت ہی اچھا اور خوبصورت بنا کر مکمل کر دیا لیکن ایک کونہ میں ایک اینٹ کی جگہ خالی چھوڑ دی پس لوگ اس مکان کو پھر پھر کر دیکھتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک اینٹ کیوں نہیں لگائی گئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ آخری اینٹ میں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں) مطلب یہ ہے کہ آپ نے نبوت کو مکان سے تشبیہ دیکر فرمایا کہ قصر نبوت میرے

[۱۵] ترمذی جلد ۲ صفحہ ... باب ...

سے پہلے مکمل ہو چکا تھا صرف ایک اینٹ کی جگہ خالی تھی وہ میرے آنے سے پُر ہوگئی لیں اب قصر نبوت میں کوئی رخنہ باقی نہیں رہا جس کو کوئی دوسرا نبی آکر پُر کرے لہٰذا جو میرے بعد دعوٰی نبوت کرے گا وہ جھوٹا کذاب ہوگا۔

(۵) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما هلك نبی خلفہ نبی وانہ لا نبی بعدی وسیکون خلفاء (الحدیث) بخاری باب ماذکر عن بنی اسرائیل) ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کی سیاست وانتظام امور انبیاء علیہم السلام کیا کرتے تھے جب ایک نبی رحلت فرما جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کے قائم مقام ہو جاتا تھا اور بتحقیق میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اور البتہ خلفاء ہوں گے) یعنی میرے بعد میری امت کے امور کا انتظام بذریعہ خلفا ہوگا کیونکہ میرے بعد سلسلہ نبوت ختم ہے میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

(۶) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی قال فشق ذالك علی الناس فقال لکن المبشرات فقالوا یا رسول اللہ وما المبشرات قال رؤیا المسلم وھی جزء من اجزاء النبوۃ) ترمذی باب ذھبت النبوۃ وبقیت المبشرات) ترجمہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رسالت و نبوت ختم ہو چکی ہے پس میرے بعد نہ تو کوئی رسول ہوگا اور نہ کوئی نبی، راوی کہتا ہے کہ آپ کا یہ فرمان سنکر لوگوں کو صدمہ ہوا (کیونکہ نبوت جو رحمت خداوندی کا دروازہ تھا وہ بند ہو گیا) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو تسکین دینے کی غرض سے) فرمایا کہ (گو نبوت ختم ہوگئی ہے) لیکن مبشرات باقی ہیں، لوگوں نے عرض کیا کہ حضور مبشرات کیا چیز ہیں آپ نے فرمایا کہ مسلم کے خواب، اور وہ نبوت کے اجزاء میں سے ایک جزء ہیں) غرض نبوت تو ختم ہوگئی ہے اس کے اجزاء میں سے صرف ایک جزء یعنی خواب رہ گئے ہیں،

(۷) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یبق من النبوۃ الا المبشرات قالوا وما المبشرات قال الرؤیا الصالحۃ) بخاری باب مبشرات)، ترجمہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نبوت سے کوئی چیز باقی نہیں رہی مگر خوشخبریاں، لوگوں نے عرض کیا کہ خوشخبریاں کیا چیز

ہیں تو آپ نے فرمایا کہ سچے خواب)

(۸) ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خارج الیٰ تبوک فاستخلف علیا قال اتخلفنی فی الصبیان والنساء قال الا ترضیٰ ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لیس نبی بعدی، بخاری باب غزوہ تبوک، ترجمہ: حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم غزوہ تبوک کی طرف تشریف لیجانے لگے تو حضرت علی (رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ) کو (اہل بیت کی نگرانی کے لیے مدینہ منورہ میں) چھوڑا تو حضرت علی نے عرض کیا کہ آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ کر تشریف لے جارہے ہیں (حضرت علی رضی اللّٰہ تعالےٰ عنہ نے آپؐ کے ہمرکاب نہ ہونے پر ملال ظاہر کیا تو) حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے (ان کو تسلی دینے کی غرض سے) فرمایا کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تم میں اور مجھ میں وہ نسبت ہو جو ہارون اور موسیٰ علیہما السلام میں تھی لیکن یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

(۹) حدثنا ابن نمیر قال حدثنا محمد بن بشر قال حدثنا اسماعیل قلت لابن ابی اوفیٰ رایت ابراھیم بن النبیؐ قال مات صغیرًا ولو قضی ان یکون بعد محمد نبیؐ عاش ابنہ ولکن لا نبی بعدہٗ

بخاری باب من سمی باسماء الانبیاء ترجمہ: اسماعیل (جو سند میں مذکور ہیں) فرماتے ہیں کہ میں نے ابن ابی اوفیٰ سے دریافت کیا کہ آپ نے حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم کو دیکھا ہے تو انہوں نے فرمایا کہ وہ تو چھوٹے ہی رحلت فرما گئے تھے اور اگر یہ فیصلہ (ازل میں) ہو چکا ہوتا کہ محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آئے گا تو آپ کے صاحبزادے زندہ رہتے ولیکن آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا) لہٰذا ان کو زندہ نہیں رکھا گیا) ابن ابی اوفیٰ کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم کے صاحبزادے کو زندہ رکھ کر نبی نہ بنانا تو حضورؐ کی شان کے خلاف ہے کہ اتنے بڑے نبی کی اولاد کو معمولی درجہ کی نبوت بھی نہ دی جائے، پس اگر آپ کے بعد نبوت کا سلسلہ باقی رہتا تو آپ کے صاحبزادے کو بھی زندہ رکھا جاتا اور نبی بنادیا جاتا لیکن سلسلۂ نبوت تو آپؐ پر ختم ہو چکا ہے لہٰذا آپ کے صاحبزادے کو زندہ ہی نہیں رکھا گیا تاکہ آپؐ کی شان کے خلاف لازم آئے۔

مذکورہ بالا آیت و احادیث میں صاف طور پر تصریح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ پس آپ کی شریعت قیامت تک باقی رہے گی کیونکہ کسی شریعت کا نسخ بغیر نبی کے نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، احادیث تو اور بھی ہیں مگر طوالت کے خوف سے ان کو ترک کر دیا ہے اور سمجھ دار کے لیے یہ بھی بہت ہیں اس مقام پر چند باتیں قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) ختم نبوت کے مسئلہ میں اہلِ اسلام کے مقابل دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ لوگ جو مسلمان ہونے کا دعویٰ ہی نہیں کرتے بلکہ اسلام کو سچا مذہب ہی نہیں تسلیم کرتے، یہود و نصاریٰ ہوں یا کوئی دوسرا فرقہ اور دوسرے وہ لوگ جو زبان سے مدعی اسلام ہیں مگر ختم نبوت کے منکر ہیں ... جیسے قادیانی وغیرہ۔

(۲) اول قسم کے لوگوں کے مقابلہ میں تو عقلی دلائل ہی پیش کیے جا سکتے ہیں۔ نقلی دلائل پر تو ان کا ایمان نہیں ہے البتہ ان کی کتابوں سے کوئی نقل اگر مفید مدعی ہو تو ان کے سامنے پیش کی جا سکتی ہے اور نقلی دلائل کا ذکر کرنا تو صرف دوسری قسم کے لوگوں کے لیے ہے کیونکہ وہ اپنی زبان سے قرآن و حدیث پر ایمان ظاہر کرتے ہیں

(۳) دوسری قسم کے لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ نبوت مستقلہ یعنی ایسی نبوت کہ جس میں نئی شریعت ہو وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی ہے آپ کے بعد کوئی نبی صاحب شریعت جدیدہ نہیں آئے گا لیکن نبوت غیر مستقلہ یعنی جس میں شریعت جدیدہ نہ ہو وہ ختم نہیں ہوئی لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسے نبی آ سکتے ہیں جو صاحب شریعت جدیدہ نہ ہوں اور مرزا صاحب قادیانی بھی اپنے آپ کو ایسا ہی نبی بتاتے تھے۔

(۴) ان لوگوں کے سامنے جب آیت (ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین) یا حدیث (لا نبی بعدی) وغیرہ ذکر کی جاتی ہے تو فوراً یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہاں تو نبوت مستقلہ کی نفی ہے مطلق نبوت کی نفی نہیں ہے لیکن ان کا یہ کہنا محض عناد پر مبنی ہے کیونکہ آیت اور احادیث میں کوئی

قید مستقلہ یا غیر مستقلہ کی نہیں ہے اگرچہ میرا مقصد اس فریق کی تردید پر موقوف نہیں ہے کیونکہ میرا مقصد اس مقام پر صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا قیامت تک باقی رہنا ثابت کرنا ہے اور اس کو یہ فریق بھی تسلیم کرتا ہے لیکن چونکہ ختمِ نبوت کا تذکرہ آگیا ہے اور اہلِ اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی غیر مستقل بھی نہیں آئے گا لہٰذا اس عقیدہ کے مخالفین کی غلط فہمی دُور کرنے کی غرض سے مزید تشریح کرتا ہوں۔

نبوتؐ و رسالتؐ و نبیؐ تینوں کلیے ہیں خواہ از جنس متواطی ہوں یا مشکک اور ان تینوں پر لانفی جنس واقع ہوا ہے جو مفید استغراق ہوتا ہے عند النحاۃ ۔ پس رسالت کی نفی سے تمام افراد رسالت کی نفی ہو گی اور نبوت کی نفی سے تمام افرادِ نبوت کی نفی ہو گی اور نبی کی نفی سے تمام افراد نبی کی نفی ہو گی اور نبوت غیر مستقلہ بھی افراد نبوت سے ہے اور ایسا ہی نبی غیر مستقل بھی افرادِ نبی سے ہے لہٰذا ان احادیث اور آیت سے نبوت غیر مستقلہ و نبی غیر مستقل کی بھی نفی ثابت اب جو شخص ان تینوں کلیوں کو بعض افراد کے ساتھ خاص کرتا ہے بلا دلیل شرعی اس کا قول محض عناد پر مبنی ہے اور احادیث میں غور کرنے کے بعد صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں نبوت غیر مستقلہ کی نفی کی تصریح ہے ایک ایک کے متعلق علیحدہ علیحدہ عرض کرتا ہوں غور فرمایئے حدیث ۲ کے متعلق دو باتیں قابلِ غور ہیں۔

(الف) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مدح میں فرمایا ہے اور مقام مدح کا تقاضا یہ تھا کہ اگر آپ کے بعد کسی قسم کی نبوت باقی ہوتی تو آپ حضرت عمرؓ کے لیے اس کا اثبات فرماتے نہ کہ نفی کرتے، پس آپ کے مطلقاً نفی فرمانے سے معلوم ہوا کہ آپ کے بعد کسی قسم کا کوئی نبی نہیں آسکتا۔

(ب) اگر حدیث میں مستقل کی قید لگائی جائے اور معنی یہ کیے جائیں کہ اگر میرے بعد کوئی مستقل نبی ہوتا تو اس صورت میں حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کا نبی غیر مستقل ہونا ضروری ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ کو منصب نبوت کے قابل و مستحق بتایا ہے اور نبوت

کے ملنے سے مانع صرف نبوت کا ختم ہونا فرمایا ہے پس جب نبوت غیر مستقل ختم نہیں ہوئی ہے تو اس کے ملنے سے کوئی مانع نہیں ہے لہٰذا وہ ضرور نبی ہونے چاہئیں، حالانکہ وہ نبی نہیں تھے، اگر ہوتے تو دعویٰ نبوت ضرور کرتے کیونکہ نبیؐ کے لیے اخفاءِ دعویٰ نبوت جائز نہیں ہے جب انہوں نے دعویٰ نہیں کیا اور نہ اہلِ اسلام میں سے کسی نے ان کو نبی کہا ہے، تو معلوم ہوا کہ وہ نبی نہیں تھے تو اب آپ غور فرما سکتے ہیں کہ جو سب سے زیادہ مستحق نبوت ہو جس کا مستحق ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ثابت ہو اس کو تو نبوت نہ ملے اور مرزا صاحب قادیان میں نبی بن جائیں، یہ فیصلہ عقل کے بالکل خلاف ہے لیکن اگر کوئی متعصب اب بھی نہ مانے تو اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے، غرض حدیث میں غور کرنے کے بعد صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلق نبوت کی نفی فرمائی ہے اور اس نفی کو کلمہ (لَوْ) کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور کلمہ (لَوْ) عربی میں اس امر کے لیے آتا ہے جو محال ہوتا ہے، تو حدیث کا حاصل یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی مستقل یا غیر مستقل کا آنا محال ہے لہٰذا آپ کے بعد جو دعویٰ نبوت کرے وہ جھوٹا ہے کیونکہ وہ امر محال کا دعویٰ کرتا ہے۔

حدیث ۳ میں چند قرائن ایسے ہیں جو اسبات پر دلالت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت غیر مستقلہ کی بھی نفی فرمائی ہے۔

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول (کلھم یزعم انہ نبی) (کذابون) کی دلیل ہے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوتِ مزعومہ کے دعویٰ کو ان کذابوں کے جھوٹا ہونے کی دلیل قرار دیا ہے حالانکہ جو کذاب آپ کے بعد پیدا ہوئے ہیں ان سب نے نبوت مستقلہ کا دعویٰ نہیں کیا تو اس سے واضح ہو گیا کہ آپ کے بعد نبوت غیر مستقلہ کا مدعی بھی کذاب ہو گا۔

۲۔ نبوتِ مزعومہ عام ہے شامل ہے نبوت مستقلہ و غیر مستقلہ کو جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے اور آپ کا قول (و انا خاتم النبیین) نبوتِ مزعومہ کے دعویٰ میں جھوٹے ہونے کی دلیل ہے تو معلوم ہوا کہ آپ کا خاتم ہونا بھی عام ہے یعنی آپ مستقل و غیر مستقل دونوں قسموں کے نبیوں

کے خاتم ہیں کیونکہ اس کو خاص کرنے کی صورت میں نبوتِ مزعومہ کی نفی کی دلیل نہیں بن سکے گا، اس لیے کہ نبوتِ مزعومہ عام ہے اور خاص کی نفی عام کی نفی کو مستلزم نہیں ہوتی حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قول کو نبوتِ مزعومہ کی نفی کی دلیل فرمایا ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ دونوں قسموں کے نبیوں کے خاتم ہیں۔

ع۳ آپ کا قول (لا نبی بعدی) تفسیر ہے (وانا خاتم النبیین) کی یا دلیل ہے اس کی، تو اس سے معلوم ہوا کہ (لا نبی بعدی) میں بھی نبی عام ہے مستقل ہو یا غیر مستقل دونوں کی نفی مراد ہے ورنہ عام کی تفسیر یا دلیل نہیں بن سکے گا۔

الحاصل قرائن کو دیکھنے کے بعد نبوتِ غیر مستقلہ کی نفی میں کسی قسم کا تردد باقی نہیں رہتا۔

حدیث ع۱ میں نبوتِ غیر مستقلہ کی ایسی تصریح ہے کہ مخالف کے لیے تاویل کی بالکل گنجائش نہیں ہے، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قصرِ نبوت میں صرف ایک اینٹ کی جگہ خالی تھی وہ میرے آنے کے بعد پُر ہوگئی اب ذرا بھی رخنہ باقی نہیں ہے جس کے پُر کرنے کے لیے کوئی دوسرا نبی آئے پس میں خاتم النبیین ہوں یعنی سب سے پیچھے آنے والا ہوں۔

اب آپ غور فرمایئے کہ جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دعوٰی نبوت کرے مرزا صاحب ہوں یا کوئی دوسرا شخص وہ اپنا روڑا کہاں لگائے گا، قصرِ نبوت میں تو کوئی جگہ خالی نہیں ہے پس لامحالہ وہ قصرِ نبوت کی بنیاد کو کھود کر اپنے روڑے کے لیے جگہ نکالے گا، ورنہ اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی، اسی وجہ سے مرزا صاحب قادیانی نے جب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد میرے روڑے کی تو کوئی جگہ نہیں ہے مجبور ہو کر قصرِ نبوت کی بنیاد پر کدال اُٹھا کر کھودنا شروع کیا تاکہ اپنے روڑے کے لیے کوئی جگہ نکالے، پس جس قصرِ نبوت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وجودِ اقدس سے مکمل فرما گئے تھے اس کو غیر مکمل ثابت کرنا شروع کر دیا اور دعوٰی کر دیا کہ نبوت ختم نہیں ہوئی ہے، غرض حدیث میں غور کرنے کے بعد کسی متنبی کے روڑے کی کوئی جگہ باقی نہیں رہتی اور آپ کا (فانا اللبنۃ) کے بعد (وانا خاتم النبیین) فرمانا صاف دلیل ہے اس

بات کی کہ آیت (ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین) میں بھی تاویل کی گنجائش اصلاً باقی نہیں ہے اور لفظ خاتم کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے اس میں بھی کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔

حدیث ۵ میں دو صریح قرینے ہیں نبوت غیر مستقلہ کی نفی پر۔

پہلا قرینہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے نبیوں کا ذکر فرمایا ہے جو صاحب شریعت مستقلہ نہیں تھے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد سینکڑوں نبی آئے جو شریعت موسویہ کے متبع تھے اور ان نبیوں کے متعلق آپ نے فرمایا کہ وہ بنی اسرائیل کے امور کا انتظام یکے بعد دیگرے فرماتے تھے اس کے بعد آپ نے فرمایا (وانہ لا نبی بعدی) یعنی میرے بعد کوئی نبی میری امت کے امور کا انتظام کرنے والا نہیں ہوگا جیسا کہ بنی اسرائیل میں یکے بعد دیگرے ہوتے رہے الغرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد ایسے نبیوں کے ہونے کی نفی کی تصریح فرمائی جیسے نبی بنی اسرائیل میں ہوتے تھے اور وہ غیر مستقل ہوتے تھے لہٰذا نبی غیر مستقل کی نفی کی تصریح ہوگئی۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد نبی کی مطلقاً نفی کرنے کے بعد صرف خلفاء کا اثبات فرمایا اگر آپ کے کلام (وانہ لا نبی بعدی) میں مستقل نبی کی نفی مراد ہوتی تو اس کے بعد آپ اثبات نبی غیر مستقل کا فرماتے نہ خلفاء کا، پس مطلقاً نبی کی نفی کرنے کے بعد صرف خلفاء کا اثبات فرمانا صریح قرینہ ہے نبی غیر مستقل کی نفی کا۔

حدیث ۶ میں بھی دو قرینے ہیں نبوت غیر مستقلہ کی نفی کے۔

پہلا قرینہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد (ان الرسالۃ والنبوۃ الخ) سے صدمہ کا ہونا۔

اس لیے کہ نبوتِ مستقلہ کا انقطاع باعثِ صدمہ نہیں ہو سکتا بلکہ باعثِ فرحت ہے باعثِ صدمہ تو نبوت مستقلہ کا عدمِ انقطاع اور نبوتِ غیر مستقلہ کا انقطاع ہے اس لیے کہ نبوت کی نفی و اثبات کی کل چار صورتیں ہیں دو صورتیں اثبات کی، یعنی اثباتِ ۱ نبوت مستقلہ و اثباتِ ۲ نبوتِ غیر مستقلہ، و نفی ۱ نبوت مستقلہ و نفی نبوت غیر مستقلہ

اثبات کی دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت (یعنی اثبات نبوت مستقلہ) باعثِ صدمہ ہے کیونکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت قیامت تک باقی نہیں رہے گی بلکہ آپ کے بعد کوئی دوسرا نبی صاحبِ شریعت مستقلہ آپ کی شریعت کو منسوخ کر دے گا اور یہ ظاہر ہے کہ یہ خبر عاشقانِ محمدیؐ کے لیے باعثِ فرحت نہیں ہوسکتی بلکہ باعثِ صدمہ ہے۔

اور اثبات نبوت کی دوسری صورت (یعنی اثبات نبوت غیر مستقلہ) باعثِ فرحت ہے کیونکہ اس صورت میں آپ کی شریعت کا نسخ بھی نہیں لازم آتا کہ باعثِ صدمہ ہو۔ اور اس میں آپ کی شریعت کو قیامت تک تازہ کرنیوالوں کے آنے کی خوشخبری بھی ہے لہٰذا باعثِ فرحت ہے۔

اور نفی کی دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت (یعنی نفی نبوتِ مستقلہ) باعثِ صدمہ نہیں ہے بلکہ باعثِ فرحت ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی شریعت قیامت تک باقی رہے گی آپ کے بعد کوئی ایسا نبی صاحبِ شریعت مستقلہ نہیں آئے گا جو آپ کی شریعت کو منسوخ کر سکے اور اظہر من الشمس ہے کہ آپ کی شریعت کے بقاء الیٰ یوم القیامۃ کی خبر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کیلئے باعثِ صدمہ نہیں ہوسکتی بلکہ اس سے بڑھکر ان کے لیے کوئی چیز باعثِ فرحت نہیں ہے۔

اور نفی کی دوسری صورت (یعنی نبوتِ مستقلہ کی نفی)، باعثِ صدمہ ہے، کیونکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کی شریعت کو تازہ کرنے والا کوئی نبی قیامت تک نہیں آئے گا اور اس خبر کا صدمہ دِہ ہونا ظاہر ہے۔

مذکورہ بالا تقریر کا حاصل یہ ہوا کہ نبوت مستقلہ کا اثبات باعثِ صدمہ ہے۔ اور اسکی نفی باعثِ فرحت، اور نبوت غیر مستقلہ کا معاملہ برعکس ہے کہ اس کا اثبات فرحت رساں ہے اور نفی صدمہ دِہ ہے۔

تو اب اس کے بعد ملاحظہ فرمایئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کی نفی فرمائی تو صحابہ کرام کو صدمہ ہوا ... غیر مستقلہ ہی کی نفی سے ہوسکتا ہے نبوت مستقلہ کی نفی سے

نہیں ہو سکتا جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے پس صدمہ کا ہونا صریح قرینہ ہے نبوت غیر مستقلہ کی نفی کا۔ اگر نبوت مستقلہ کی نفی مراد ہوتی تو فرحت ہونی چاہیے تھی نہ کہ صدمہ۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ صحابہ کرام کو میرا ارشاد سن کر صدمہ ہوا ہے تو ان کی تسکین خاطر کے لیے فرمایا (لکن المبشرات) کہ گھبراؤ نہیں خوشخبریاں باقی ہیں یعنی نبوت بجمیع اجزائہا منقطع نہیں ہوئی ہے بلکہ اس کا ایک جزو خوشخبریاں (یعنی سچے خواب) قیامت تک باقی رہے گا۔ تو آپ کا نفی نبوت کے بعد فقط مبشرات ہی کا مستثنیٰ فرمانا صریح قرینہ ہے نفی نبوت غیر مستقلہ کا اگر علاوہ مبشرات کے کوئی اور چیز بھی نبوت سے باقی ہوتی تو آپ اس کو ضرور مستثنیٰ فرماتے خصوصاً صحابہ کرام رضہ کے صدمہ کو دیکھنے کے بعد بھی اس کا ذکر نہ کرنا شان نبوی کے خلاف ہے لیکن باوجود اس کے بھی آپ کا سوا مبشرات کے اور کسی چیز کا مستثنیٰ نہ فرمانا بڑا زبردست قرینہ ہے نفی نبوت غیر مستقلہ کا، مگر تعصب کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔

حدیث ۷ میں تو آپ نے بالکل ہی معاملہ صاف کر دیا ہے کیونکہ صاف لفظوں میں فرما دیا کہ نبوت سے کوئی چیز باقی نہیں رہی مگر مبشرات اس سے زیادہ اور کیا تصریح ہو۔

حدیث ۸ کے سیاق میں نظر کرنے سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول (الا انہ لیس نبی بعدی) میں نبوت مستقلہ کی نفی کی ہے اس لیے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ کیا تو اس بات پر راضی نہیں ہے کہ تم میں اور مجھ میں وہ نسبت ہو جو موسیٰ و ہارون علیہما السلام میں تھی اور وہ نسبت مرکب تھی دو امروں سے، قائم مقامی اور اشتراک فی النبوۃ تو اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال آیا کہ ایسا نہ ہو کہ کہیں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ غلط فہمی ہو کہ مجھ میں بھی وہ دونوں امر ہیں جو حضرت ہارون علیہ السلام میں تھے حالانکہ آپ کا مقصود صرف ایک امر (یعنی قائم مقامی) کا اظہار تھا یعنی آپ کو صرف یہ بتانا تھا کہ میرے اس غزوہ میں جانے کے بعد تو میرا قائم مقام ہے جیسا کہ حضرت ہارون موسیٰ علیہ السلام کے قائم مقام تھے کوہِ طور پر جانے کے بعد، تو اس غلط فہمی کے

کے ازالہ کے لیے آپؐ نے فرمایا (الا انہ لیس نبی بعدی) کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا یعنی تو صرف میرا قائم مقام ہے نبی نہیں ہے، تو اب آپ کا اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے نبوت کی نفی کرنا صاف دلیل ہے اس بات کی کہ آپ نے ایسی نبوت کی نفی کی ہے جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حاصل تھی اور وہ نبوت غیر مستقلہ تھی کیونکہ حضرت ہارون علیہ السلام کوئی نئی شریعت نہیں رکھتے تھے بلکہ شریعتِ موسویہ کے تابع تھے اور موسیٰ علیہ السلام ہی نے اپنے نبی ہونے کے بعد ان کی نبوت کی درخواست کی تھی اور درخواست میں اس بات کی تصریح بھی کردی تھی کہ ان کو میرے تابع بنایا جائے جیسا کہ سورۂ طٰہٰ کی آیت واجعل لی وزیرا من اھلی ھارون اخی اشدد بہ ازری واشرکہ فی امری سے صاف ظاہر ہے تو اس سے صاف طور پر واضح ہو گیا کہ آپ نے لیس نبی بعدی میں نبوت غیر مستقلہ کی نفی فرمائی ہے۔

یا یوں کہا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نبوت کی نفی فرمائی ہے جس کے متعلق آپ کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کا ثبوت اپنے حق میں نہ سمجھ جائیں کیونکہ آپ کو انہی کی غلط فہمی دور کرنی منظور تھی اور وہ بھی نبوت غیر مستقلہ تھی کیونکہ نبوت مستقلہ کا وہم تو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق غیر ممکن تھا، بچند وجوہ :

(۱) نبی مستقل دوسرے نبی کی قائم مقامی نہیں کرسکتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا قائم مقام بنا کر غزوہ پر جا رہے تھے تو ان کو قائم مقامی کی حالت میں کیسے خیال آسکتا ہے کہ میں مستقل نبی ہوں البتہ نبوت غیر مستقلہ کا وہم پیدا ہوسکتا ہے کیونکہ قائم مقامی اس کے منافی نہیں ہے بلکہ اس کی مؤید ہے۔

(۲) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی غلط فہمی کا منشا حضرت ہارون علیہ السلام کی نبوت تھی تو لامحالہ ان کو ایسی ہی نبوت کا خیال آسکتا تھا جو حضرت ہارون میں تھی اور وہ نبوت غیر مستقلہ تھی کیونکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلوم تھا کہ حضرت ہارون مستقل نبی نہیں تھے بلکہ موسیٰ علیہ السلام کے تابع تھے تو باوجود اس کے وہ اپنے متعلق نبوت مستقلہ کا خیال کیسے کرسکتے تھے۔

البتہ نبوتِ غیر مستقلہ کا خیال آسکتا تھا کیونکہ منشاء میں نبوت غیر مستقلہ ہی تھی۔

(۳) نبی مستقل کے لیے نئی شریعت کا ملنا لازمی ہے اور وہ بغیر وحی آسمانی کے نہیں مل سکتی پس جس شخص پر اصلاً وحی نہ نازل ہوئی ہو اور نہ اس کو شریعت ملی ہو، بلکہ ایک نبی کا زمانہ دراز سے اُمتی چلا آ رہا ہو اس کو کیسے خیال آسکتا ہے کہ میں نبی مستقل ہوں، کیا نبوت مستقلہ کوئی خیالی پلاؤ ہے۔

(۴) جب حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآن شریف میں نص صریح پڑھ چکے ہیں کہ آپ خاتم النبیین ہیں آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا تو ان کو کیسے خیال آسکتا ہے کہ میں مستقل نبی ہوں وغیر ذالک۔

الحاصل حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے متعلق نبوت مستقلہ کا خیال آنا تو غیر ممکن تھا، پس لامحالہ ماننا پڑے گا کہ نبوت غیر مستقلہ کے وہم کا اندیشہ تھا اس لیے کہ جب آپ نے فرمایا کہ مجھ میں اور تجھ میں وہ نسبت ہے جو موسیٰ و ہارون علیہما السلام میں تھی تو ممکن ہے کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ خیال آئے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کی نبوت کی درخواست کی تھی اور خداوند تعالیٰ نے منظور فرمائی تھی شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی میری نبوت کے متعلق درخواست کی ہو اور منظور ہو گئی ہو تو اس وجہ سے ان کو اپنے متعلق نبوت غیر مستقلہ کا وہم پیدا ہونے کا اندیشہ تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (الا انہ لیس نبی بعدی) سے اس کو صاف کر دیا

حدیث ۶ مرفوع حدیث نہیں ہے بلکہ موقوف ہے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی نبی غیر مستقل کی نفی ہے کیونکہ ابن ابی اوفیٰ کا یہ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے کو اس لیے زندہ نہیں رکھا گیا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کے صاحبزادے کو زندہ رکھ کر نبی نہ بنایا جائے تو یہ بات آپؐ کی شان کے خلاف ہے، اس لیے ان کو زندہ ہی نہیں رکھا گیا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کی شان کے خلاف نبی مستقل نہ بنانے میں لازم آتا ہے یا نبی غیر مستقل

نہ بنانے میں، کوئی عاقل نہیں کہہ سکتا کہ آپ کے صاحبزادے کو نبی مستقل نہ بنانے کی صورت میں آپ کی خلاف شان لازم آتا ہے، کیونکہ اگر آپ کے صاحبزادے کو نبی بنایا جاتا اور شریعت نئی نہ دی جاتی بلکہ اپنے والد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شریعت کے پابند بنائے جاتے تو اس میں کوئی بات خلاف شان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں تھی بلکہ خلاف شان تو آپ کے صاحبزادے کو مستقل نبی بنانے کی صورت میں ہے کیونکہ اس صورت میں حضورؐ کی شریعت آپ کے صاحبزادے کی شریعت سے منسوخ ہوگی اور آپ کی شریعت کا منسوخ ہونا آپ کی شان کے خلاف ہے تو معلوم ہوا کہ آپ کے صاحبزادے کو نبی غیر مستقل نہ بنانا آپ کی شان کے خلاف ہے، پس اگر نبوت غیر مستقلہ باقی ہوتی تو آپ کے صاحبزادے کو زندہ رکھا جاتا لیکن اب زندہ نہیں رکھا گیا اس لیے کہ نبوت غیر مستقلہ بھی باقی نہیں ہے تاکہ ان کو زندہ رکھ کر نبی بنایا جائے اور زندہ رکھ کر نبی نہ بنانا آپ کی شان کے خلاف ہے لہٰذا آپ کے صاحبزادے کو زندہ ہی نہیں رکھا گیا، تو اب اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت غیر مستقلہ بھی باقی نہیں ہے، الحاصل مذکورہ بالا آیت و احادیث سے واضح ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی مستقل یا غیر مستقل قیامت تک نہیں آسکتا، جو دعوٰی نبوت کرے گا وہ جھوٹا کذاب ہوگا۔ ممکن ہے کہ کسی شخص کو یہ خیال پیدا ہو کہ تمام احادیث میں جب نبوت غیر مستقلہ کی نفی ہے تو نبوت مستقلہ کی نفی کی کیا دلیل ہوگی تو اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ نبوت مستقلہ کی نفی فریقِ مخالف کے نزدیک مسلم ہے اس کی دلیل کی ضرورت نہیں ہے مختلف فیہ صرف نبوت غیر مستقلہ ہے اور اس کے علاوہ آیت وخاتم النبیین مطلق نبوت کی نفی کرتی ہے جیسا کہ اوپر اس کی تشریح گذر چکی ہے اور احادیث کو نبوت غیر مستقلہ کی نفی پر حمل کرنے کے یہ معنی نہیں تھے کہ ان میں نبوتِ مستقلہ کی نفی نہیں ہے بلکہ مطلب یہ تھا کہ تمام احادیث میں اس قسم کے قرائن موجود ہیں جو دلالت کرتے ہیں اس بات پر کہ نبوت غیر مستقلہ نفی نبوت میں قطعاً داخل ہے نہ یہ معنی کہ نبوتِ مستقلہ نفی نبوت میں داخل ہی نہیں ہے۔

دلائلِ عقلیہ

(۱) جب آپ کا نبی ہونا دلائل سے ثابت ہے اور اہلِ کتاب بھی آپ کے نبی ہونے کو خاص عرب کے لیے تسلیم کر چکے ہیں تو آپ کا ہر دعویٰ سچا ہوگا، کیونکہ نبی کا جھوٹ بولنا محال ہے کیونکہ جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے اور نبی کا معصوم یعنی گناہوں سے پاک ہونا ضروری ہے جس کی تشریح ابتدا میں گذر چکی ہے اور آپ نے اپنی زبان مبارک سے دعویٰ خاتم الانبیاء ہونے کا کیا ہے پس ماننا پڑے گا کہ آپ خاتم الانبیاء ہیں۔

(۲) جس قدر انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے ہیں ان سب کی تعلیم سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اعلیٰ و افضل ہے اور اظہر من الشمس ہے کہ معلم اعلیٰ کی تعلیم سب سے آخر حاصل کی جاتی ہے کیونکہ جب تک ابتدائی مراتب تعلیم کے پہلے حاصل نہ کیے جائیں انتہائی تعلیم کا حاصل کرنا دائرہ امکان سے خارج ہوتا ہے، اسی وجہ سے معلم اعلیٰ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام پیغمبروں کے بعد بھیجا گیا۔

باقی رہی یہ بات کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا دیگر حضرات کی تعلیم سے اعلیٰ و افضل ہونا کیونکر معلوم ہو تو اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ جس شخص کو اس امر میں تردد ہو وہ آپ کی تعلیم اور باقی حضرات کی تعلیم میں نظرِ انصاف سے دیکھے تو انشاء اللہ تعالیٰ یہ امر آفتاب کی طرح روشن ہو جائیگا، غور کرنے والے کو آپ کی تعلیم میں بہ نسبت باقی تعلیموں کے دو طرح کا امتیاز حاصل ہوگا، ایک یہ کہ آپ سے پہلے جس قدر حضرات تشریف لائے ہیں ان سب کی تعلیم مخصوص ہوتی تھی، خاص خاص صیغوں کے ساتھ مگر آپ کی تعلیم جامع ہے تمام صیغوں کو، جس کی قدرے تشریح اوپر بھی گذر چکی ہے اور دوسرا امتیاز یہ ہے کہ ہر صیغہ کے قواعد کی تشریح و تفصیل اور ان میں مصلحتِ عامہ کا لحاظ جس قدر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں ہے کسی دوسرے نبی کی تعلیم میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں پایا جاتا۔

(۳) کسی نبی کے بعد دوسرے نبی کے آنے کی ضرورت دو وجہ سے ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ کسی

صیغہ کی تعلیم غیر مکمل رہ گئی ہو تو اس کی تکمیل کے لیے کوئی دوسرا نبی بھیج دیا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پہلے نبی کی تعلیم میں تحریف ہو گئی ہو دنیا میں صحیح تعلیم باقی نہ رہی ہو تو دوسرا نبی صحیح تعلیم دیکر بھیج دیا جاتا ہے تاکہ لوگ صحیح تعلیم سے محروم نہ رہیں۔

لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے بعد نہ تو کوئی صیغہ تعلیم غیر مکمل رہا ہے جس کی تکمیل کی غرض سے کسی دوسرے نبی کو بھیجا جائے اور نہ آپ کی تعلیم میں تحریف واقع ہوئی ہے اور نہ قیامت تک ہو گی تاکہ کسی دوسرے نبی کو بھیجکر صحیح تعلیم سے آگاہ کرنے کی ضرورت ہو کیونکہ خداوند تعالیٰ نے قرآن شریف کو تحریف سے قیامت تک محفوظ رکھنے کا اعلان فرما دیا ہے جو سورہ حجر کی آیت (انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون) میں مذکور ہے۔ یعنی تحقیق ہم نے ہی اتارا ہے ذکر (یعنی قرآن شریف) اور ہم ہی ہیں البتہ اس کے نگہبان) اور تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال کا مشاہدہ اس بات کا گواہ ہے کہ قرآن شریف میں آج تک ایک حرکت کی تبدیلی بھی نہیں ہوئی، حروف و کلمات کی تبدیلی تو درکنار رہی، تو اب آپ غور فرماویں کہ آپ کے بعد کسی نبی کے بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔

(۴) آپ کے بعد مستقل نبی کا آنا تو فریقِ مخالف کے نزدیک بھی مسلّم ہے، متنازع فیہ تو غیر مستقل نبی کا آنا ہے لہٰذا اس کے متعلق فریقِ مخالف سے چند امور دریافت طلب ہیں۔

(الف) یہ مسئلہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے اس قابل نہیں کہ اس میں صرف رائے زنی سے کام لیا جائے بلکہ اس کے اثبات کے لیے نصوص قطعیہ کا ہونا ضروری ہے لہٰذا کوئی ایسی نص شرعی مرحمت فرمایئے جو نبوت غیر مستقلہ کے عدمِ انقطاع پر صراحتہً دال ہو اور خیر القرون میں اس کا اس دعوٰی کے لیے دلیل ہونا تسلیم بھی کیا گیا ہو، اس کے دلیل ہونے کا دارومدار صرف آپ کا اجتہاد نہ ہو۔

(ب) نبوت غیر مستقلہ کے ملنے کا دارومدار کیا چیز ہے اس کی تعیین و دلیل دونوں کے بیان کرنے کے بعد بتلایئے کہ وہ چیز جو صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں بھی تھی یا نہیں اگر تھی

تو ان کو نبوت کیوں نہیں ملی اور اگر نہیں تھی تو یہ بات اجماع امت کے خلاف ہے، کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا تمام امت میں افضل ہونا مجمع علیہ ہے اور صورت مفروضہ میں غیر صحابی کا صحابہ سے افضل ہونا لازم آتا ہے اس لیے کہ نبی غیر نبی سے افضل ہوتا ہے، لہٰذا یہ شق جو مستلزم ہے خلاف اجماع کو، یہ مردود ہے قابل تسلیم نہیں ہے اور علاوہ اس کے یہ بات فیصلہ عقل کے بھی خلاف ہے، کونسا عاقل اس بات کو تسلیم کر سکتا ہے کہ مرزا صاحب جیسوں میں ایسی خوبی پائی جائے جس سے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے حضرات بھی محروم رہے ہوں

(ج) کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ساڑھے تیرہ سو سال میں سوا مرزا صاحب کے کوئی اور نبی بھی مبعوث ہوا ہے یا نہیں اگر ہوا ہے تو اسکا حوالہ عنایت ہو اور اگر نہیں ہوا تو اس کی وجہ بیان فرمایئے کہ باوجود نبوت منقطع نہ ہونے کے اس قدر زمانہ دراز تک لوگوں کو اس نعمت عظمیٰ سے کیوں محروم رکھا گیا کیا وجہ ہے کہ اس قدر طویل مدت میں سوا مرزا صاحب کے امت میں سے کوئی دوسرا شخص اس منصب کا مستحق نہیں ہوا اتنے عرصہ کے بعد یکایک مرزا صاحب ہی کو ڈھونڈے یہ بات نصوص صریحہ کے خلاف ہونے کے علاوہ دائرہ عقل سے بھی خارج ہے۔

(د) کیا تارک فریضۂ اسلام بھی نبی ہو سکتا ہے یا نہیں، شق اول تو اجماع امت کے خلاف ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا مجمع علیہ ہے اور تارک فریضہ بوجہ مرتکب ہوتے گناہ کبیرہ کے معصوم نہیں ہے اور برتقدیر شق ثانی مرزا صاحب باوجود تارک ہوتے فریضہ حج کے کیونکر نبی بن گئے کیونکہ انہوں نے باوجود استطاعت کے تمام عمر میں فریضۂ حج کو ادا نہیں کیا جس کے ترک کو قرآن شریف کی آیت (ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین) میں کفر سے تعبیر کیا گیا ہے منصب نبوت کے مستحق ایسے ہی لوگ ہوا کرتے ہیں جو تارکِ فرائض ہوں، سمجھدار آدمی تو ایسے شخص کو مسیلمہ کذاب سے کم نہیں سمجھ سکتا۔

الحاصل دلائل عقلیہ ونقلیہ دونوں سے ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی مستقل یا غیر مستقل نہیں آئے گا لہٰذا آپ کی شریعت قیامت

تک باقی رہے گی اور آپ کی دعوت کا تمام دنیا کے لیے عام ہونا پہلے ثابت ہو چکا ہے تو ان دونوں باتوں کے ثابت ہونے سے واضح ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم منصبِ نبوت میں سب سے اعلیٰ و افضل تھے۔

جب آپ کا منصبِ نبوت میں سب سے افضل ہونا ثابت ہوا تو ماننا پڑے گا کہ سب سے اقرب الی اللہ بھی آپ ہی تھے کیونکہ منصبِ نبوت کے ملنے کا دارومدار قرب پر ہے جس قدر قرب زیادہ ہو گا اسی قدر منصبِ نبوت بھی اعلیٰ ملے گا، پس منصبِ نبوت سب سے اعلیٰ ملنا دلیل ہے اقرب الی اللہ ہونے کی لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام انبیاء علیہم السلام سے اقرب الی اللہ ہونا بھی ثابت ہو گیا اس کے اثبات کے لیے مستقل دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

الحاصل آپ کا منصبِ نبوت میں سب سے اعلیٰ و افضل ہونا اور سب سے زیادہ اقرب الی اللہ ہونا دونوں امر دلائل سے ثابت ہو گئے اور یہی معنی تھے آپؐ کے افضل الانبیاء ہونے کے اہل اسلام کے نزدیک اور اہلِ اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ افضلیت مخصوص ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی دوسرے نبی میں نہیں پائی جاتی اور نہ کسی نبی نے اس افضلیت کا سوا آپؐ کے اپنی زبان مبارک سے دعویٰ کیا ہے۔

مذکورہ بالا بحث کے بعد گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرب الی اللہ ہونے کے متعلق کسی مزید تحقیق کی ضرورت نہیں ہے لیکن تبرّعاً کچھ عرض کرتا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خداوند تعالیٰ کے دربار میں تمام پیغمبروں سے زیادہ قریب ہونا!

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرب الی اللہ ہونے کے متعلق بہت سے نصوص ہیں نمونہ کے طور پر چند ذکر کرتا ہوں تاکہ رحمۃ للعالمینؐ کی شان کا اندازہ ہر شخص کو آسانی سے معلوم ہو جائے۔

(۱) لا تجعلوا دعاء الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضا (سورہ نور) (ترجمہ مت مقرر کرو بکارنا پیغمبر کا درمیان اپنے مثل پکارنے بعض تمہارے کے بعض کو) اس آیت میں مفسرین نے چند تفسیریں کی ہیں منجملہ ان کے ایک تفسیر یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے بندوں کو حضور صلی اللہ

علیہ وسلم کے پکارنے کے متعلق ایک خاص طریقہ تعلیم فرمایا ہے تاکہ پکارنے میں بھی آپ کی عظمتِ شان کو محفوظ رکھیں جس کا حاصل یہ ہے کہ بندوں کو حکم فرمایا ہے کہ جب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلانا چاہو تو آپ کا نام لے کر نہ بلایا کرو، جیسا کہ آپس میں ایک دوسرے کا نام لیکر بلاتے ہو، یعنی یا محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کہکر نہ بلانا کیونکہ یہ طریقہ ادب کے خلاف ہے بلکہ یا رسول اللہ، یا یا نبی اللہ کہکر بلانا[۱]، اس لیے کہ عام طور پر دستور ہے کہ نام لیکر اس شخص کو بلایا جاتا ہے جس کو اپنے برابر یا اپنے سے کم درجہ کا سمجھا جاتا ہے، جس کو اپنے سے بڑا سمجھا جاتا ہے اس کو نام لیکر بلانا خلافِ ادب قرار دیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے کوئی شخص باپ کو نام لیکر نہیں بلاتا تو اب اگر کوئی شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نام لیکر بلائے تو بظاہر یہی سمجھا جائے گا کہ وہ آپ کو بڑا نہیں سمجھتا حالانکہ ایک مسلمان کے نزدیک خداوند تعالیٰ کے بعد آپؐ سے بڑھکر نہ باپ ہو سکتا ہے نہ کوئی دوسرا اس واسطے خداوند تعالےٰ نے اہلِ ایمان کو خاص طور پر تعلیم دی ہے کہ آپ کو نام لیکر نہ بلایا کرو کیونکہ یہ آپ کی عظمت وشان کے خلاف ہے۔

اب آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کا اندازہ فرمائیے کہ خداوند تعالےٰ نے بھی قرآن شریف میں اسی طریقہ مقررہ کی پابندی اپنے ذمہ لازم فرمائی، اور آپ کو کہیں بھی نام لیکر نہیں پکارا جب پکارا تو یا ایہا النبی یا ایہا الرسول وغیرہ کہکر پکارا۔ اور باقی انبیاء علیہم السلام کو صاف طور پر نام لیکر پکارا۔ آدم علیہ السلام کو یا آدم کہکر پکارا اور ابراہیم علیہ السلام کو یا ابراہیم کہکر پکارا اور موسیٰ علیہ السلام کو یا موسیٰ کہکر پکارا اور عیسیٰ علیہ السلام کو یا عیسیٰ کہکر پکارا اور نوح علیہ السلام کو یا نوح کہکر پکارا، ان تمام حضرات کو نام لیکر پکارنے کی تصریح قرآن شریف میں موجود ہے[۲]۔

اب آپ خود اندازہ فرمائیے کہ خداوند تعالےٰ کے دربار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کس درجہ کا قرب تھا کہ احکم الحاکمین نے بھی کبھی آپ کا نام لیکر نہ پکارا اور اہلِ ایمان کو بھی خاص طور پر تعلیم فرمائی کہ نام لے کر نہ پکارنا اور باقی نبیوں میں سے جو بڑے سے اولوالعزم تھے مثل ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ و نوح علیہم السلام کے ان کو بھی نام لیکر پکارا۔ اوروں کا تو کیا کہنا، کیا آپ کے اقرب الی اللہ ہونے میں اب بھی

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ صفحہ ۱۵۰ مطبوعہ مصر [۲] کتاب الشفاء لقاضی عیاض رحمہ اللہ تعالیٰ الفصل السابع صـ ۲۳

کوئی کسر باقی ہے؟

اعتراض: خداوند تعالیٰ کو نام لیکر پکارنا (یعنی یا اللہ کہنا) خلافِ ادب نہیں قرار دیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نام لیکر پکارنا خلافِ ادب قرار دیا گیا ہے، حالانکہ خداوند تعالےٰ کی شان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سے بہت بلند ہے، پھر ان کو نام لیکر پکارنا خلافِ ادب کیوں نہیں قرار دیا گیا؟

جواب: اس کی وجہ یہ ہے کہ نام لیکر پکارنا خلافِ ادب وہاں ہوتا ہے جہاں اس بات کا اندیشہ ہو کہ سننے والوں کو یہ وہم پیدا ہو کہ نام لیکر پکارنے والا اپنے سے بڑا نہ سمجھنے کی وجہ سے نام لے کر پکار رہا ہے اور جہاں اس بات کا اندیشہ نہ ہو وہاں خلافِ ادب قرار نہیں دیا جاتا اس وہم کا اندیشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پکارنے میں تھا کیونکہ پکارنے والا بھی بشر اور آپ بھی گو مجسم رحمت خداوندی تھے مگر از جنس بشر تھے تو اسی مجانست کی وجہ سے وہم پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید پکارنے والا بوجہ ہم جنس ہونے کے بڑا نہ سمجھتا ہو۔ چنانچہ منکرین اسی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کی عظمت کے قائل نہیں ہوتے تھے بلکہ (ما ھذا الا بشر) کہکر الگ ہو جاتے تھے، مگر خداوند تعالےٰ کو پکارنے میں یہ وہم نہیں کیا جا سکتا کہ پکارنے والا خداوند تعالیٰ کو اپنے سے بڑا نہ سمجھتا ہو۔ مثنوی مولانا روم میں اس کی نظیر موجود ہے۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ممبر کے تین درجے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے اوپر والے درجے پر بیٹھا کرتے تھے، جب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالےٰ عنہ خلیفہ ہوئے تو دوسرے درجہ پر بیٹھے اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی خلافت میں سب سے نیچے والے درجہ پر بیٹھے اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو سب سے اوپر والے درجہ پر بیٹھے تو ایک شخص نے اعتراض کیا کہ کیا وجہ ہے کہ دونوں خلیفہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ پر نہیں بیٹھے آپ کیوں بیٹھ گئے؟ تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے جواب دیا کہ میں اگر ان دونوں میں سے کسی کی جگہ پر بیٹھتا تو شاید دیکھنے والوں کو یہ خیال پیدا ہوتا کہ میں اپنے آپ کو ان کے درجہ کا سمجھتا ہوں حالانکہ

میں ان کے درجہ کا نہیں ہوں، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ پر بیٹھنے میں میرے متعلق کسی مسلمان کو یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ میں اپنے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر سمجھتا ہوں۔

(۲) قد نریٰ تقلب وجھك فی السمآء فلنولینك قبلۃ ترضٰھا (سورہ بقرہ،

ترجمہ: ہم آپ کے منہ کا بار بار اٹھنا آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں اس لیے ہم آپ کو اس قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے جس کے لیے آپ کی مرضی ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ کا کعبہ کچھ مدت کے لیے بیت المقدس رہا جو یہود کا کعبہ ہے، مگر آپ کی دلی تمنا یہ تھی کہ میرا کعبہ قبلہ ہو جو مکہ معظمہ میں ہے اور اسی امید میں کہ شاید اس کے متعلق وحی آئے بار بار آسمان کی طرف دیکھا کرتے تھے کہ شاید فرشتہ حکم لا رہا ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم آپ کے لیے وہی قبلہ مقرر کر دیں گے جس کے لیے آپ کی مرضی ہے یعنی ہم کو تو آپ کی خوشی منظور ہے لہٰذا ہم آپ کی مرضی کے موافق کر دیں گے اسی واسطے فرمایا کہ جس قبلہ کے لیے آپ کی مرضی ہے، یہ نہیں فرمایا کہ جس قبلہ کے لیے ہماری مرضی ہے۔

امام رازی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: (والاشارۃ فیہ کانہ تعالیٰ قال یا محمد کل احد یطلب رضائی وانا اطلب رضاك فی الدارین اما فی الدنیا فھٰذا الذی ذکرناہ واما فی الآخرۃ فقولہ تعالیٰ ولسوف یعطیك ربك فترضیٰ)[1] کہ اس میں اشارہ ہے اس بات کا کہ گویا خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے میرے حبیب ہر شخص میری رضا طلب کرتا ہے اور میں دونوں جہانوں میں آپ کی رضا طلب کرتا ہوں، دنیا میں آپ کی رضا طلب کرنے کا ظہور تو آپ کی مرضی کے موافق قبلہ مقرر کرنے میں ہے اور آخرت میں آپ کی مرضی طلب کرنے کا ذکر سورہ ضحیٰ کی آیت (ولسوف یعطیك ربك فترضیٰ) میں ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کو آخرت میں اس قدر عطا کروں گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔

الحاصل خداوند تعالیٰ نے دنیا میں بھی آپ کی مرضی کے مطابق قبلہ کو بدل کر آپ کو خوش کیا۔ اور آخرت میں آپ کو خوش کرنے کا وعدہ فرمایا تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۴ صفحہ ۲۲۴ مطبوعہ مصر

کو دربار خداوندی میں کس قدر قرب حاصل تھا۔

(۳) ورفعنا لک ذکرک) سورۂ الم نشرح ،ترجمہ: اور ہم نے آپ کی خاطر آپ کا آوازہ بلند کیا۔ یعنی اکثر جگہ شریعت میں اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ آپ کا نام مبارک ملا کر ذکر کیا گیا ہے، مرفوع حدیث میں اس کی تفسیر ہے کہ (قال اللہ تعالیٰ اذا ذکرتُ ذُکرتَ معی[۱]) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اے حبیب جہاں میرا ذکر ہوگا میرے ساتھ ساتھ آپ کا بھی ذکر ہوگا۔ مثلاً خطبہ میں تشہد میں، نماز میں، اذان میں اقامت میں، غرض اللہ تعالیٰ اپنے ذکر کو اپنے حبیب کے ذکر سے جدا کرنے کو پسند نہیں فرماتے جس سے ہر ذی عقل اندازہ کر سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کس درجہ کا قرب حاصل ہے۔

(۴) ترمذی شریف میں مذکور ہے کہ ایک روز صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اس بات پر تعجب ظاہر کر رہے تھے کہ خداوند تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا ہے اور موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور عیسیٰ علیہ السلام کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں اور آدم علیہ السلام کو خداوند تعالیٰ نے برگزیدہ بنایا، یہ تذکرہ ہو رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا کہ میں نے تمہارا تذکرہ سنا ہے بیشک ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں اور موسیٰ علیہ السلام نجی اللہ ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ و کلمۃ اللہ ہیں اور آدم علیہ السلام صفی اللہ ہیں اور سن لو میں حبیب اللہ ہوں یعنی میرے رب نے مجھے حبیب اللہ کا لقب عطا فرمایا ہے۔ جو تمام لقبوں سے افضل و اعلیٰ ہے[۲]

اگرچہ آیات و احادیث اس مضمون کی بہت ہیں مگر اس رسالہ کی حیثیت اجازت نہیں دیتی کہ ان سب کا ذکر کروں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرب الی اللہ ہونے کا اظہار دنیا میں واقعۂ معراج میں کیا گیا حتیٰ کہ تمام انبیاء علیہم السلام نے بیت المقدس میں جمع ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا امام بنا کر آپ کے پیچھے نماز پڑھی اور اس کے بعد آپ کو آسمانوں کی طرف سیر کرائی گئی اور تمام آسمانوں میں آپ کی شان و شوکت کو ظاہر کرتے ہوئے رب العزت نے اپنے خاص دربار

[۱] تفسیر جامع البیان ص ۵۱۸، تفسیر خازن جلد ۶ ص ۵۲۲/۵۳۱، تفسیر مدارک جلد ۶ ص ۵۳۱ (مجموعۃ التفاسیر) مطبوعہ بیروت تفسیر روح المعانی جلد ۱۵ ص ... [illegible]

میں بلاکر تحفے عطا فرمائے ، اور قیامت کے روز آپ کا قرب خداوندی میں ممتاز ہونا شفاعت کبریٰ کی صورت میں تمام اہلِ محشر کے سامنے نمایاں کیا جائے گا۔ تمام اہلِ محشر بڑے بڑے اولوا العزم نبیوں کے پاس جاکر عرض کریں گے کہ آپ خداوند تعالےٰ کی جناب میں صرف اتنی گذارش کریں کہ اہل محشر کا حساب شروع ہو جائے تو کوئی نبی اس روز اس کام کے لیے تیار نہیں ہوگا اور اہلِ محشر سے فرمائیں گے کہ یہ کام آج سوائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا پس تمام اہلِ محشر آپ کے پاس آکر عرض کریں گے تو آپ اس کو منظور فرما کر خداوند تعالےٰ کے دربار میں اہلِ محشر کی شفاعت کریں گے اور خداوند تعالےٰ منظور فرمائیں گے جس سے تمام اہلِ محشر پر آپ کا اقرب الی اللہ ہونا آفتاب کی طرح روشن ہوگا۔[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت پر حضرات نصاریٰ کی طرف سے چند اعتراض کیے گئے ہیں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا جواب دے دوں تاکہ عوام الناس ان کی وجہ سے غلط فہمی میں نہ واقع ہوں۔

اعتراض اوّل : حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اہلِ مکہ نے تنگ کیا حتیٰ کہ شہید کرنے پر آپ کو آمادہ ہو گئے تو آپ کو مکہ معظمہ سے ہجرت فرما کر مدینہ منورہ میں تشریف لے جانے کا حکم ہوا مگر آسمان پر نہیں اُٹھایا گیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو جب یہود قتل کرنے لگے تو ان کو با قرار اہلِ اسلام چوتھے آسمان پر اٹھا لیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آپؐ سے افضل تھے۔

جواب : اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جو افضلیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے اس سے مراد منصبِ نبوت میں سب سے بڑا ہونا اور دربارِ خداوندی میں سب سے زیادہ اقرب ہونا ہے اور آسمان پر اُٹھایا جانا اس افضلیت کو مستلزم نہیں ہے۔ ورنہ حضرت ادریس علیہ السلام بھی افضل الانبیاء ہونے چاہییں کیونکہ ان کے متعلق بھی قرآن شریف میں تصریح ہے کہ (ورفعنا ہُ مکاناً علیا) ہم نے ان کو بلند مکان پر اُٹھا لیا، بلکہ حضرت ادریس علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ افضل ہونے چاہییں اس لیے کہ ان کے متعلق بعض حضرات کا خیال ہے کہ ان کو ساتویں

---

[1] ترمذی جلد ۲ ص ۶۶ مسلم جلد ۱ باب اثبات الشفاعت۔

آسمان پر اُٹھا لیا[1] تو اب آپ بتلائیں کہ جس کو چوتھے آسمان پر اُٹھا لیا گیا ہے وہ افضل ہوگا یا جس کو ساتویں آسمان پر اُٹھا لیا گیا ہے وہ افضل ہوگا، بلکہ آسمان پر اُٹھایا جانا تو نفسِ نبی ہونے کو بھی مستلزم نہیں ہے۔ چہ جائیکہ اس کو افضل الانبیاء ہونے کی دلیل ٹھہرایا جائے کیونکہ مفسرین نے تصریح کی ہے کہ حضرت آسیہ بنتِ مزاحم فرعون کی بیوی نے جب فرعون سے تنگ آکر دُعا کی تو خداوند تعالیٰ نے ان کو مع جسدِ عنصری زندہ اُٹھا کر جنت میں داخل کر دیا اب وہ جنت میں زندہ ہیں کھاتی ہیں پیتی ہیں اور نہایت آرام کے ساتھ رہتی ہیں حالانکہ وہ نبی بھی نہیں تھیں۔

الحاصل جب آسمان پر اُٹھایا جانا نفسِ نبی ہی کو مستلزم نہیں ہے تو پھر اس کو افضلیت کی دلیل ٹھہرانا تو سراسر غلطی ہے۔

۲۔ عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر اُٹھایا جانا اظہارِ قرب کی غرض سے نہیں تھا تاکہ اس کو اقرب الی اللہ ہونے کی دلیل بنایا جا سکے بلکہ دشمنوں سے بچانے کی غرض سے تھا، جیسا کہ ان کے واقعہ سے صاف ظاہر ہے، اظہارِ قرب کے لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا گیا تھا جس کی تفصیل واقعہ معراج میں ہے جو مخصوص ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ، اگر حضرات نصاریٰ کے پاس اس کے مقابلہ میں کوئی چیز ہو تو پیش کریں۔

۳۔ عیسیٰ علیہ السلام کا دشمنوں سے بچا کر زندہ اُٹھایا جانا گو اہلِ اسلام کا عقیدہ ہے مگر حضرات نصاریٰ تو اس کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ ان کا تو یہ عقیدہ ہے کہ وہ مصلوب ہوئے، تو ان کے اعتقاد کے مطابق تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم افضل ہوئے، کیونکہ گو ان کو آسمان پر نہیں اُٹھایا گیا مگر دشمنوں کے ہاتھ سے شہید تو نہیں کرایا گیا بلکہ بچا لیا جس طرح بھی بچا لیا۔ لیکن عیسیٰ علیہ السلام کو تو بچایا ہی نہیں گیا بلکہ دشمنوں کے ہاتھ سے مصلوب کر دیا۔ اب آپ انصاف سے بتائیں کہ افضل وہ ہے جس کو بچا لیا گیا یا وہ ہے جس کو سولی دلوا دیا گیا۔

اور علاوہ اس کے یہ گزارش ہے کہ افضلیت کا قصہ تو بعد کھڑے کرنا اول تو یہ بات طے ہونی چاہیے کہ عیسیٰ علیہ السلام جب خدا تھے یا خدا ان میں حلول کیے ہوئے تھا تو وہ مصلوب کیسے ہو گئے

---

[1] روح المعانی جلد ۱۶ ص ۱۰۶ مطبوعہ ملتان، تفسیر قرطبی جلد ۱۸ ص ۲۰۳ مطبوعہ قاہرہ، تفسیر خازن جلد ۶ ص ۶۰۸ مطبوعہ بیروت جلالین ص ۲۵۵ مطبوعہ کراچی

کیا خدا ہونے کے باوجود ان میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ اپنی جان کو سولی سے بچا سکتے کیا خدا رحلت بھی فرما جایا کرتا ہے، خدا کے واسطے ذرا تو انصاف کرو۔

باقی رہی یہ بات کہ اہلِ اسلام کے عقیدہ کے موافق کیا وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو آسمان پر اُٹھا لیا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ اُٹھایا گیا بلکہ ہجرت کا حکم دیا گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فقط بنی اسرائیل ہی کے لیے نبی تھے کسی دوسری قوم کے لیے نبی نہیں تھے تاکہ کسی دوسری جگہ جا کر نبوت کا کام کر سکتے اور جن کے لیے نبی تھے انھوں نے جان سے مارنے کا ارادہ کر لیا تو لامحالہ ان کو آسمان پر اُٹھانا پڑا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تمام دنیا کے لیے نبی تھے لہٰذا اگر مکہ معظمہ میں رہ کر کام نہیں کر سکتے تو مدینہ منورہ میں رہ کر کریں گے، آپ کو اگر مدینہ منورہ میں بھی دقت پیش آتی تو پھر بھی آپ کو آسمان پر نہ اُٹھایا جاتا بلکہ کسی دوسری جگہ چلے جانے کا حکم ملتا اس طرح تمام دنیا میں گھومتے رہتے مگر آسمان پر نہ اُٹھائے جاتے کیونکہ آپ تو جہاں بھی جاتے وہیں نبوت کا کام کر سکتے تھے پھر آپ کو آسمان پر اُٹھا کر بیکار کیوں رکھا جاتا۔

اعتراض دوم: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس درجہ کے مقدس و پاکدامن تھے کہ تمام عمر شادی ہی نہیں کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت سے شادیاں کی ہیں تو معلوم ہوا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ سے افضل تھے۔

جواب: شادی کا نہ کرنا اور عورتوں سے جدا رہنا نبی کے لیے باعث فضل و کمال نہیں ہے بلکہ مقصد نبوت کی تکمیل میں نقصان دہ ہے کیونکہ نبی مکمل اصلاح کر ہی نہیں سکتا جب تک کہ اس میں تمام لوازمِ بشریت پورے طور پر نہ پائے جائیں، اگر خواص بشریت کا نہ ہونا نبی کے لیے باعث کمال ہوتا تو ملائکہ ہی کو نبی کیوں نہ بنایا جاتا۔

غرض جس کو آپ باعث فضل و کمال تعبیر سے ہیں وہ حقیقت میں باعث نقصان ہے جس قدر لوازمِ بشریت نبی میں کم ہوں گے اسی قدر تکمیل مقصد نبوت میں کمی آئے گی اس کی پوری تشریح اوپر گذر چکی ہے۔ ملاحظہ فرمالیجیے!

۲۔ عیسیٰ علیہ السلام چونکہ بغیر باپ پیدا ہوئے تھے اس وجہ سے ان میں قوتِ رجولیت بہت کم تھی اسی وجہ سے انہوں نے تمام عمر کوئی شادی نہیں کی اور بوجہ کمزوری کے شادی نہ کرنا کوئی کمال نہیں ہے ، بلکہ جس قدر دنیا میں کمزور و نامرد ہیں اکثر ان میں سے شادی نہیں کرتے اور نہ ناجائز طریقہ سے بدکاری کرتے ہیں لیکن یہ ان کا کمال نہیں شمار کیا جاتا ، ایسا ہی اگر عیسیٰ علیہ السلام نے بوجہ کمزوری قوتِ رجولیت کے شادی نہ کی ہو تو کوئی کمال کی بات نہیں ، کمال تو یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی طاقت کے ہوتے ہوئے صبر کر کے دکھائے جیساکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھایا۔ کیونکہ آپؐ نے پچیس سال تک کوئی شادی نہیں کی جو نہایت ہی جوشِ جوانی کا زمانہ ہے حالانکہ آپ میں چالیس آدمیوں کی طاقت تھی اور اس پر طرہ یہ کہ کسی دشمن نے بھی آپ پر کبھی بدنگاہی کا الزام بھی نہیں لگایا ، بدکاری تو درکنار رہی ، کمال اس کو کہتے ہیں ، اور پھر پچیس سال کے بعد بھی شادی کی تو ایک بیوہ عورت کے ساتھ ، جو علاوہ دو دفعہ بیوہ ہونے کے آپؐ سے عمر میں بھی بڑی تھیں یعنی حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ۔ اور جب تک وہ زندہ رہیں آپ نے دوسرا نکاح نہیں کیا اور ان کی رحلت کے بعد بھی جس قدر نکاح کیے بیوہ عورتوں ہی سے کیے ۔ سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا کے ، حالانکہ آپ کو اعلیٰ درجہ کی خوبصورت دوشیزہ عورتیں مل سکتی تھیں ۔ مگر آپ کا نکاح کرنے سے مقصد چونکہ شہوت رانی نہیں تھا بلکہ مقصد یہ تھا کہ ازواجِ مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ علیہن اجمعین کے ذریعہ سے دین کا وہ حصہ مکمل ہو جائے جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے اس مقصد کے لیے نوجوان لڑکیوں سے تجربہ کار عورتیں زیادہ مفید تھیں ، الحاصل عیسیٰ علیہ السلام کا شادی نہ کرنا افضلیت کی دلیل نہیں ہے ۔

اعتراض سوم: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات بڑے ہیں بہ نسبت معجزات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام افضل ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ۔

جواب: معجزات کی تشریح جو اوپر گذر چکی ہے اس کو دیکھنے کے بعد سمجھدار آدمی تو اس گفتگو ہی کو فضول سمجھتا ہے کہ کس نبی کے معجزات بڑے ہیں اور کس کے چھوٹے لیکن معاندین چونکہ انصاف کو بالائے طاق رکھ کر بات کرتے ہیں، لہٰذا ممکن ہے کہ ان کو تسکین نہ آئے لہٰذا قدرے اس بات کی تشریح کرتا ہوں کہ معجزات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہ نسبت معجزات باقی انبیاء علیہم السلام کے کیا شان امتیازی رکھتے ہیں۔ معجزات دو قسم کے ہوتے ہیں ایک معجزات علمی دوسرے معجزات عملی، لہٰذا ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ بیان کرتا ہوں۔

مُعجزاتِ علمیّہ

معجزاتِ علمیہ اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص دعوائے نبوت کر کے ایسے علوم ظاہر کرے کہ سب لوگ ان علوم کے مقابلہ سے عاجز آجائیں اور معجزات علمیہ افضل ہوتے ہیں معجزاتِ عملیہ سے اس لیے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ علم افضل ہے عمل سے یہی وجہ ہے کہ ہر فن کے استادوں کی تعظیم کی جاتی ہے اور ہر صیغہ کے افسروں کو تنخواہ زیادہ دی جاتی ہے، حالانکہ ان کے ماتحت والے خدمت زیادہ کرتے ہیں اور محنت زیادہ اٹھاتے ہیں اور افسروں کو محنت بہت ہی کم کرنی پڑتی ہے یہ شرف علم نہیں تو اور کیا ہے، اور ایسا ہی بسا اوقات امتی آدمی مجاہدہ وریاضت میں انبیاء علیہم السلام سے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں مگر مرتبہ میں پھر بھی کم ہوتے ہیں اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ شرفِ علم وتعلیم جو انبیاء علیہم السلام کے پاس ہے وہ امتی کے پاس نہیں ہوتا، غرض انبیاء علیہم السلام کو امتیوں سے امتیاز بوجہ علم وتعلیم ہی ہوتا ہے نہ بوجہ ریاضت وعبادت کے، تو ثابت ہوا کہ علم افضل ہے عمل سے لہٰذا معجزات علمیہ بھی افضل ہوں گے معجزات عملیہ سے اب مقابلہ کر کے دیکھو کہ معجزات علمیہ میں کون افضل ہے؟ جس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات علمیہ کے افضل ہونے میں تردد ہو اس کو قرآن شریف میں غور کرنا چاہیے کہ یہ تمام معجزات علمیہ سے افضل و تمام علوم کو جامع ہے اس لیے کہ اس میں علم ذات وصفات بھی اس قدر ہے کہ کوئی دوسری کتاب روئے زمین پر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، علم برزخ وآخرت بھی اس قدر مفصل لکھا ہے کہ اور کہیں ملنا ممکن نہیں، علم اخلاق واحوال واعمال میں وہ رنگ دکھایا ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر

نہیں ہے، علم تاریخ پر وہ روشنی ڈالی ہے جس کا جواب ناممکن ہے، علم تدبیر منزل وسیاست مدن میں وہ خوبی دکھائی ہے کہ دوسری جگہ اس کا وجود محال ہے اگر کسی کو یقین نہ ہو تو کوئی دوسری کتاب اس کے مقابلہ میں لائے اور پھر فصاحت و بلاغت کا یہ حال ہے کہ کسی فصیح و بلیغ سے آج تک نہ مقابلہ ہو سکا اور نہ قیامت تک ہو سکے گا اور اس کی عبارت ہر کس و ناکس پر اس طرح ممتاز ہے جس طرح اعلیٰ درجہ کا خوبصورت بدصورتوں میں ممتاز ہوتا ہے یا اعلیٰ درجہ کے خوشنویس کا خط... بدنویسوں کے خط سے ممتاز ہوتا ہے۔ الحاصل معجزاتِ علمیہ میں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام انبیاء علیہم السلام سے ممتاز ہونا اظہر من الشمس ہے محتاج دلیل نہیں ہے قرآن شریف موجود ہے جس کا جی چاہے مقابلہ کر کے دیکھ لے۔

معجزاتِ عملیہ

معجزاتِ عملیہ اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص دعویٰ نبوت کر کے ایسے کام کر کے دکھائے کہ سب لوگ اس کے مقابلہ میں عاجز آجائیں کوئی دوسرا ایسے کام کر کے نہ دکھا سکے، باقی رہی یہ بات کہ معجزاتِ عملیہ کس نبی کے اعلیٰ و افضل ہیں تو اس کے متعلق بعض انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات سے مقابلہ کر کے دکھاتا ہوں۔ اس کے بعد اہل انصاف فیصلہ کریں کہ کس کے معجزات اعلیٰ و افضل ہیں؟۔

معجزاتِ عیسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ

قبل اس کے کہ معجزات کا مقابلہ کر کے دکھاؤں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ اس امر کو واضح کر دوں کہ معجزات کے اعلیٰ و افضل ہونے کا معیار کیا ہے تا کہ مقابلہ کے بعد آسانی سے معلوم ہو سکے کہ کس کے معجزات اعلیٰ و افضل ہیں، معجزہ کے لغوی معنی اوپر گذر چکے ہیں اور اصطلاح میں معجزہ کہتے ہیں ایسے امر کو جو خلاف عادت نبی کے ہاتھ پر ظاہر کیا جاتا ہے ایسی وجہ پر کہ تمام منکرین کو عاجز کر کے دکھا دے کوئی شخص اس امر میں اس کا مقابلہ نہ کر سکے تو جس قدر عادت کے زیادہ خلاف ہوگا اسی قدر وصف اعجاز میں اعلیٰ و افضل ہوگا اور جس قدر عادت کے قریب ہوگا اسی قدر وصفِ اعجاز میں

کم درجہ کا ہوگا۔ اب اس معیار کے مطابق معجزات عیسیٰ علیہ السلام و معجزات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کر کے دیکھو اور فیصلہ کرو کہ معجزات کس کے اعلیٰ تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مُردے زندہ کیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کھجور کے سوکھے ستون کو زندہ کیا، لیکن جو مردے عیسیٰ علیہ السلام نے زندہ کیے وہ پہلے بھی زندہ رہ چکے تھے اور زمانہ دراز تک محل حیوٰۃ بن چکے تھے مگر درخت کبھی محل حیوٰۃ نہیں ہوا، پس ایک محل حیوٰۃ میں اعادہ حیوٰۃ کرنا اتنا مستبعد نہیں جتنا ایسی چیز میں حیوٰۃ کا پیدا کرنا مستبعد ہے جو کبھی محل حیوٰۃ بنی ہی نہ ہو، اور لکڑی بھی اگر تر ہوتی تو گو وہ بھی محل حیوٰۃ تو نہیں لیکن تاہم اس کو کسی قدر حیوٰۃ سے مناسبت ہوتی لیکن لکڑی اور پھر سوکھی اس کا زندہ کرنا تو بہت ہی مستبعد ہے

الحاصل عیسیٰ علیہ السلام نے مردوں کو زندہ کرنے کے بعد کوئی ایسی بات نہیں دکھائی جو پہلے زمانہ حیوٰۃ میں ان میں نہ پائی جاتی ہو بلکہ نفس حیوٰۃ سابقہ ہی کا اعادہ کیا اس کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر سوکھی لکڑی کو صرف ہرا درخت بنا کر دکھا دیتے تو جب بھی وصف اعجاز میں عیسیٰ علیہ السلام سے کم نہ ہوتے بلکہ مساوی ہوتے کیونکہ دونوں جگہ اعادہ حالت سابقہ علی التسویہ پایا جاتا لیکن آپ نے تو سوکھی لکڑی میں وصف حیوٰۃ پیدا کر دیا جو کبھی اس سے پہلے اس میں پیدا ہی نہیں ہوا تھا اور پھر حیوٰۃ بھی معمولی درجہ کی نہیں بلکہ وہ حیوٰۃ جس میں کمال درجہ کا ادراک و شعور ہو جو سوا اشرف المخلوقات (یعنی انسان) کے کسی دوسرے جانور میں پایا ہی نہ جاتا ہو کیونکہ وہ سوکھا ستون در فراق رحمۃ للعالمین میں ایک سمجھدار انسان کی طرح چیخیں مار مار کر رویا جب تک آپ نے منبر سے اتر کر اس کو گلے سے نہیں لگایا اور پیار و محبت نہیں کیا وہ خاموش ہی نہیں ہوا اس قدر روتا تھا کہ خطبہ پڑھنا تنگ کر دیا بڑی مشکل سے خاموش ہوا۔

اس کے بعد یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام جب تک مردے زندہ کرنے کا ارادہ فرما کر خاص طور پر توجہ نہیں فرماتے تھے کوئی مردہ زندہ نہیں ہوتا تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس ستون کو زندہ کرنے کا ارادہ تک بھی نہیں فرمایا بلکہ اس سے علیحدگی اختیار فرمائی تو آپ کے

علیحدہ ہونے کی وجہ سے وہ خود بخود زندہ ہوکر دردِ فراقِ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں چیخ اُٹھا۔

دوسرا معجزہ عیسیٰ علیہ السلام کا گارے کے جانور بنا کر اُڑانا تھا۔ گارے کو لے کر پہلے جانور کی شکل بناتے تھے اس کے بعد اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ خداوند تعالیٰ کی قدرت سے زندہ ہوکر اُڑجاتا تھا غرض اس کو کم از کم شکل میں تو زندوں سے مناسبت حاصل ہوجاتی تھی لیکن اس سوکھی لکڑی کو تو صورت و شکل میں بھی زندوں سے مناسبت نہیں حاصل ہوئی تھی بلکہ اپنی اصلی شکل میں رہ کر زندہ ہوگئی۔ لہٰذا یہ زیادہ مستبعد ہے اور پھر گارے کے جانوروں میں صرف معمولی درجہ کا حیوٰۃ پیدا ہوتا تھا مگر اس سوکھے ستون میں علاوہ حیوٰۃ کے اعلیٰ درجہ کا ادراک و شعور بھی پیدا ہوگیا تھا جس کی تشریح ابھی گذری ہے، تو صرف حیوٰۃ کے پیدا ہونے سے یہ زیادہ مستبعد ہے۔

تیسرا معجزہ عیسیٰ علیہ السلام کا تھا بیماروں کا اچھا کرنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کہتے ہی خداوند تعالیٰ بیماروں کو اچھا کردیتے تھے اس کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ لگاتے ہی ٹوٹی ہوئی ٹانگ فوراً صحیح ہوجاتی ہے اور بگڑی ہوئی آنکھ آپؐ کے ہاتھ لگاتے ہی بالکل اچھی ہوجاتی ہے، یہ فقط یونہی بیماروں کے اچھے ہوجانے سے کہیں زیادہ ہے کیونکہ وہاں تو اس سے زیادہ نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کے کہنے سے بیماروں کو اچھا کردیا تو اس میں صرف قدرتِ خداوندی کا اظہار ہے کچھ برکت جسمانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نہیں پائی جاتی اور یہاں دونوں موجود ہیں، کیونکہ فاعلِ حقیقی تو یہاں بھی خداوند تعالیٰ ہی ہے لہٰذا قدرت کا اظہار یہاں بھی ہوا لیکن بواسطہ جسمِ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) اس قدرت کا اظہار کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپؐ کا جسمِ مقدس منبع البرکات ہے۔

اب ان تمام باتوں کو دیکھ کر اہلِ انصاف فیصلہ کریں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے مقابلہ میں معجزاتِ عیسویہ کو کیا نسبت تھی، مگر تعصب کا کوئی علاج نہیں ہوسکتا۔

معجزاتِ موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ

موسیٰ علیہ السلام کا عصا زندہ ہو کر سانپ بن جاتا تھا اس کے مقابلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تصدق سوکھی کھجور کی لکڑی زندہ ہوتی ہے سوکھی لکڑی میں جان آجاتی ہیں تو دونوں برابر لیکن اس کے بعد فرق یہ ہے کہ عصا کی شکل سانپ کی ہو جانے کے بعد اس میں آثارِ حیوٰۃ نمایاں ہوتے ہیں تو اس کو شکل میں تو زندوں سے مناسبت پیدا ہو جاتی ہے لیکن کھجور کی سوکھی لکڑی کی شکل بھی نہیں بدلتی اپنی اصلی شکل میں رہ کر زندہ ہوتی ہے، یہ زیادہ تعجب انگیز بات ہے اور دوسرا فرق یہ ہے کہ عصا میں صرف معمولی درجہ کا حیوٰۃ آتا ہے لیکن اس سوکھی لکڑی میں علاوہ حیوٰۃ کے ادراک و شعور بھی اعلیٰ درجہ کا پیدا ہوتا ہے جس کی تشریح اوپر گذر چکی ہے اور سانپ میں سوا خواص نوع سانپ کے اور کوئی بات پیدا نہیں ہوئی، الحاصل عصا کا صرف سانپ بن جانا اس قدر مستبعد نہیں ہے جس قدر ایک سوکھی لکڑی کا بغیر تبدیلی شکل کے انسان بن جاتا اور کمال ادراک و شعور ظاہر کرنا اور اسی طرح پتھروں کا انسان کی طرح آپ کو سلام کرنا عصا کے سانپ بننے سے بدرجہا زیادہ مستبعد ہے اور ایسا ہی درختوں کا اپنی شکل میں رہ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں اپنی جگہ سے حرکت کرنا اور پردہ کرنے کی خاطر مل جانا کمال ادراک پر دلالت کرتا ہے جو بغیر انسان کے کسی دوسرے حیوان میں نہیں پایا جا سکتا یہ تمام معجزات عصا کے سانپ بنتے اور مردوں کے زندہ ہونے سے بدرجہا مستبعد ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ یہ بھی تھا کہ پتھر سے پانی نکلتا تھا اس کے مقابلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے پانی نکلا، پانی تو دونوں جگہوں سے نکلا مگر پتھر سے پانی کا نکلنا اتنا تعجب خیز نہیں ہے جتنا گوشت و پوست سے نکلنا تعجب انگیز ہے۔

اور علاوہ اس کے پتھر سے پانی نکلنے میں تو صرف قدرتِ خداوندی کا اظہار ہے مگر دستِ مبارک سے پانی نکلنے میں علاوہ قدرت کے اظہار کے اس بات پر بھی دلالت ہے کہ آپ کا دستِ مبارک منبع فیوض تھا اور ایسا ہی آپ کے تھوکنے سے کوئیں میں پانی کا زیادہ ہوتا بتلاتا ہے کہ جسمِ مبارک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معدن برکات تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ ید بیضا بھی تھا

اسکے مقابلہ میں بعض صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی چھڑی کے سر پر بطفیل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اندھیری رات میں جب وہ آپ کی خدمت اقدس سے رخصت ہونے لگے روشنی ہو گئی اور وہ جانے والے دو صحابی تھے جہاں سے راستہ جدا ہوا وہاں روشنی بھی منقسم ہو کر دونوں کے ساتھ ہو لی اب خیال فرمایئے کہ دست مبارک موسیٰ علیہ السلام اگر گریبان میں ڈالنے کے بعد بوجہ قرب قلب منور و روشن ہو جاتا تھا تو اول تو وہ نبی دوسرے قلب کا قرب تو اگر بوجہ قرب نور قلب دست موسوی میں نور آ جائے تو کیا تعجب ہے وہ صحابی تو دونوں نبی بھی نہ تھے اور نہ ان کی لکڑی کو قرب وجوار نور قلب سے تھا بلکہ فقط برکت صحبت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) تھی تو اب اہل انصاف فیصلہ کریں کہ معجزات کس کے اعلیٰ وافضل تھے۔

معجزہ خلیل اللہ سے مقابلہ

آتش نمرود میں خلیل اللہ کے جسم کا نہ جلنا واقع میں ایک بہت بڑا معجزہ تھا لیکن وہ اتنا تعجب خیز نہیں تھا جتنا اس دستر خوان کا آگ میں نہ جلنا جو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بطور تبرک نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) تھا اور وہ بھی ایک بار نہیں بلکہ بار بار اس قسم کا اتفاق ہوا کہ جب میل چکناہٹ زیادہ ہوا فوراً آگ میں ڈالدیا جب میل چکناہٹ جل گیا نکال لیا۔ اور یہ قصہ مثنوی مولینا روم میں مذکور ہے، اب خیال فرمایئے کہ ایک آدمی کا نہ جلنا اتنا تعجب خیز نہیں ہے جتنا کھجور کے پتوں کے دستر خوان کا اور وہ بھی ایسا کہ جس پر چکناہٹ بھی ہوتی ہو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دستر خوان میں زمین وآسمان کا فرق تھا اور وہ خود نبی اور یہ بھی ایسے کہ خلیل اللہ اور دستر خوان میں فقط اتنی ہی بات کہ گا ہے گا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھا گیا اور آپ نے اس پہ کھانا کھایا۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کے مقابلہ میں ان حضرات کے معجزات کی یہ کیفیت ہے باوجود ان کے اولوالعزم ہونے کے تو باقی حضرات کے معجزات کا تو آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کی کیا کیفیت ہو گی؟

الحاصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات علمیہ وعملیہ تمام انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے اعلیٰ وافضل ہیں لہذا اگر افضلیت کا دارومدار معجزات ہی پر رکھا جائے تو تب بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی افضل الانبیاء ثابت ہوں گے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام جسقدر معجزات لائے تھے جب دنیا سے رحلت فرمائی تو ان کو بھی ساتھ ہی لے گئے اس وقت اگر آپ چاہیں کہ کسی نبی کے معجزہ کا مشاہدہ کریں تو غیر ممکن ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحلت کے بعد بھی قیامت تک اپنا معجزہ (یعنی قرآن شریف) باقی چھوڑ گئے جو آپ کا علمی معجزہ ہے اور تمام معجزات سے اعلیٰ وافضل ہے کوئی مخالف اس کے مقابلہ میں سر نہیں اٹھا سکتا جس کی قدرے تشریح اوپر گذر چکی ہے اور مزید تفصیل عنقریب آئے گی غرض آپ کی صداقت کی دلیل مخالفین کے سامنے ہر وقت موجود ہے اسی کے متعلق فرمایا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ما من الانبیاء من نبی الا قد اعطی من الایات ما مثلہ آمن علیہ البشر وانما کان الذی اوتیت وحیا اوحی اللہ الی فارجو ان اکون اکثرھم تابعا یوم القیامۃ (متفق علیہ) ترجمہ: کہ نہیں پیغمبروں میں سے کوئی پیغمبر مگر کہ تحقیق دیا گیا معجزات میں سے اس قدر کہ مثل اس قدر کے ایمان لا سکے اس پر بشر اور بیشک جو چیز کہ مجھے عطا کی گئی ہے وہ وحی ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری طرف بھیجی ہے پس میں امید کرتا ہوں کہ میں قیامت کے روز از روئے تابعداروں کے تمام پیغمبروں سے ... ہوں گا) مطلب یہ ہے کہ ہر نبی کو اپنے اپنے زمانہ میں ایسے معجزات عطا کیے گئے کہ ان کو دیکھ کر لوگوں کو ان کی صداقت کا یقین ہو سکے مگر ہر نبی کے معجزات اسی کے زمانہ کے ساتھ مخصوص تھے اس کی رحلت کے بعد معجزات بھی منقطع ہو گئے لیکن مجھے جو معجزہ دیا گیا ہے وہ قیامت تک باقی رہے گا، ہر زمانہ میں اس کو دیکھ کر لوگ ایمان لائیں گے اسی وجہ سے میرے تابعین قیامت کے روز زیادہ ہوں گے اور وہ معجزہ قرآن شریف ہے، جس کی تشریح اوپر گذر چکی ہے

حضرات نصاریٰ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت پر اعتراضات تو اور بھی کیے گئے ہیں لیکن افضلیت کی تشریح مذکورہ بالا میں غور کرنے والا ان سب کا جواب نہایت

آسانی کے ساتھ دے سکتا ہے لہٰذا ان سب کا ذکر کرنا بے فائدہ تطویل ہے۔

جو معنی افضلیت کے بیان کیے گئے ہیں وہ کسی دوسرے نبی میں کوئی شخص ثابت نہیں کر سکتا اور نہ کسی نبی نے سوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس افضلیت کا دعویٰ کیا ہے تو اب اگر کوئی شخص کسی دوسرے نبی میں وہ افضلیت ثابت کرنا چاہے تو اوّل تو وہ (مدعی سُست گواہ چست) کا مصداق ہوگا اور دوسرے اس دعوای کو پایۂ ثبوت تک پہنچانا غیر ممکن ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قطعہ عرب میں مبعوث ہونے کی حکمت

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام دنیا کا ہادی و مصلح بنا کر بھیجا گیا تھا جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے لیکن اظہر من الشمس ہے کہ تمام دنیا کی اصلاح بلا واسطہ ایک شخص سے ممکن نہیں ہے اگرچہ اس کو ہزار سال سے بھی زیادہ عمر دی جائے خصوصاً ایسے شخص سے کہ اس کو فقط تیئیس سال اس کام کے لیے دیئے جائیں اور قلت سامان کی یہ حالت ہو کہ گذر اوقات کی خاطر قوم کی بکریاں چراتا ہو، سلطنت و لشکر کا ہونا تو درکنار رہا، اور بچپن میں یتیم ہونے کا صدمہ بھی اُٹھا چکا ہو اور لکھنے پڑھنے کی یہ حالت ہو کہ کبھی قلم ہاتھ میں نہ پکڑا ہو اور کسی استاد سے ایک حرف تک بھی نہ سیکھا ہو، لہٰذا مصلحت کا تقاضا یہ ہوا کہ کسی ایک قوم کو منتخب کر کے پہلے آپ کو اس قوم میں بھیجا جائے تاکہ اوّل اس قوم کی اصلاح کر کے اس کو اپنا دست و بازو بنا کر اس کے ذریعہ سے آپ تمام دنیا کی اصلاح کر سکیں۔

پس آپ کی بعثت کے دو حصے ہو جائیں گے اوّلاً بالذات اس قوم کی اصلاح اور ثانیاً بالواسطہ باقی تمام لوگوں کی اصلاح، کیونکہ وہ قوم بمنزلہ آلہ کے ہو گی اور آلہ کا حصول مقدم ہوتا ہے جب تک آلہ نہ ہو کام نہیں ہو سکتا ایسا ہی جب تک اس قوم کی اصلاح پہلے نہیں ہو گی تو تمام دنیا کی اصلاح براہِ راست ایک شخص سے ممکن نہیں ہے۔

اس انتخاب کا قرعہ فیصلہ ازلی میں قطعہ عرب پر واقع ہوا لہٰذا رحمۃ للعالمین ﷺ کو مکہ معظمہ میں قوم قریش میں مبعوث کیا گیا۔

باقی رہی یہ بات کہ قطعہ عرب کے انتخاب میں کیا حکمت تھی کہ تمام دنیا کو چھوڑ کر اسی قطعہ کو منتخب کیا گیا، تو اس کے متعلق یہ گذارش ہے کہ اس میں تین حکمتیں تھیں۔

حکمت اوّل: سنتِ خداوندی یہ ہے کہ اپنے بندوں کی اصلاح کے لیے ہر کام میں وہ راستہ تجویز فرماتے ہیں جو تمام راستوں سے زیادہ آسان و مختصر ہو اس سنت کو مدّ نظر رکھتے ہوئے آپ کی بعثت کے لیے مکہ معظمہ سے بہتر اور کوئی قطعہ زمین کا نہیں تھا اس لیے کہ جس نبی کو تمام دنیا کی اصلاح کرنی ہو اس کی بعثت کے لیے وہ جگہ منتخب ہونی چاہیے جو تمام دنیا کے وسط میں بمنزلہ مرکز کے ہو تاکہ ہر طرف آسانی سے پہنچ سکے اگر اس کو ایک کنارے پر کھڑا کیا جائے تو اس کو بہت بڑی دِقّت پیش آئے گی اور تمام زمین کا وسط اور مرکز بیت اللہ ہے امام رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ (قالوا الکعبۃ سرۃ الارض ووسطہا) خانہ کعبہ زمین کی ناف ہے لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ معظمہ میں مبعوث کیا گیا۔

حکمت دوم: قطعہ عرب نعمتِ نبوت سے زمانہ دراز سے محروم چلا آرہا تھا اور یہود جو ملک شام میں آباد تھے وہ آباو اجداد سے نعمتِ نبوت سے بہرہ یاب تھے عرب کے لوگ جب ملک شام میں بغرض تجارت جاتے تھے تو یہودی کی طرف حسرت کی نگاہ سے اس طرح دیکھا کرتے تھے جس طرح ایک محتاج جو آباؤ اجداد سے محتاج چلا آرہا ہو ان لوگوں کی طرف حسرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے جو آباو اجداد سے اغنیاء چلے آرہے ہوں اور عرب کو اسی وجہ سے اُمیّین (یعنی ناخواندے) کہا جاتا تھا کہ وہ زمانۂ دراز سے نعمتِ نبوت سے محروم چلے آرہے تھے۔

پس رحمتِ الٰہیہ کو جوش آیا کہ ان کی سینکڑوں برسوں کی محرومی کو دور کر کے دولت نبوت سے ان کو سرفراز فرمائے اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے قطعہ عرب کو منتخب کیا گیا اس وجہ کو قرآن شریف میں متعدد جگہ بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ یٰسٓ میں ہے (تنزیل العزیز الرحیم لتنذر قوما ما انذر اٰباء ھم فھم غفلون) ترجمہ: یہ قرآن شریف خدائے زبردست مہربان کی طرف سے نازل کیا گیا ہے تاکہ آپ ایسے لوگوں کو ڈراویں جن کے باپ دادے

نہیں ڈرائے گئے تھے سو اسی وجہ سے یہ بے خبر ہیں) اور سورۂ قصص میں ہے (ولکن رحمۃ من ربک لتنذر قوما ما اتٰھم من نذیر من قبلک لعلھم یتذکرون) ترجمہ! ولیکن آپ اپنے رب کی رحمت سے نبی بنائے گئے تاکہ آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا کیا تعجب ہے کہ وہ نصیحت قبول کریں) دونوں آیتوں میں قوم سے مراد عرب ہیں اور دونوں آیتوں کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ یہ لوگ زمانۂ دراز سے نعمت نبوت سے محروم تھے لہٰذا رحمتِ الٰہیہ کو جوش آیا کہ ان کی محرومی کو دور کیا جائے۔

اور اس حکمت کا حاصل دوسری عبارت میں یہ ہے کہ وہ امراض روحانیہ جن کا علاج کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام بھیجے جاتے ہیں وہ امراض قطعۂ عرب میں انتہا کو پہنچ گئے تھے حتیٰ کہ بیت اللہ جیسی پاک جگہ بیت الاصنام بنی ہوئی تھی۔ تین سو ساٹھ بت بیت اللہ کے ارد گرد رکھے ہوئے تھے اور ایسا ہی باقی خرابیاں بھی حد سے گذر گئی تھیں اور اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ لوگ زمانۂ دراز سے نعمتِ نبوت سے محروم تھے کوئی مصلح ان کے پاس نہیں آیا تھا۔۔۔۔ الحاصل یہ لوگ روحانی ڈاکٹر کے زیادہ محتاج تھے بہ نسبت اوروں کے لہٰذا ان کی روحانی بیماریوں نے بزبان حال دربارِ خداوندی میں دستِ دعا دراز کر کے روحانی ڈاکٹر کی درخواست کی رحمتِ خداوندی نے فوراً بتقاضائے (اجیب دعوۃ الداع اذا دعان) منظوری فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور ان بیماروں کی اصلاح کے لیے ایک ایسا زبردست مصلح بھیجا جو تمام مصلحین کا سرتاج تھا۔

حکمت سوم۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے اوّلاً ایک قوم کا منتخب کرنا تو ضروری تھا جس کی تشریح اوپر گذر چکی ہے لیکن مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ قوم منتخب کی جائے جو مقصد بعثت کے پورا کرنے میں زیادہ انفع ہو اور وہ مقصد تمام دنیا کی قوموں کی اصلاح ہے، لہٰذا پہلے ایسی قوم منتخب ہونی چاہیئے جو دنیا بھر کی قوموں سے زیادہ بہادر و قوی ہو، اگرچہ اس کی اصلاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت زیادہ

دقتیں پیش آئیں کیونکہ ایسی بہادر قوم کی اصلاح ہو جانے کے بعد وہ تمام دنیا کی قوموں کو ٹھیک کر دے گی۔ بے شک ایسی قوم کا ٹھیک کرنا بہت ہی مشکل ہوگا کیونکہ وہ بوجہ قوت و شجاعت کے آسانی سے اطاعت قبول نہیں کرے گی لیکن جب ٹھیک ہو جائے گی تو دنیا بھر کی قومیں اس کے آگے سرِ تسلیم خم کریں گی، یہ بات بھی قطعۂ عرب ہی میں پائی جاتی تھی۔ تمام قطعۂ عرب دنیا بھر کی قوموں سے زیادہ بہادر تھا، خصوصاً قوم قریش بہادری میں تمام قطعۂ عرب میں ممتاز تھی، لہٰذا مصلحت کا تقاضا یہی تھا، کہ آپؐ کو قریش میں مبعوث کیا جائے۔

آپؐ کو جو ان لوگوں کی اصلاح میں دقتیں اُٹھانی پڑیں وہ محتاجِ بیان نہیں ہیں مگر اس قوم نے اصلاح پذیر ہونے کے بعد جو دنیا کی اصلاح کا کام کیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے، ان لوگوں نے قیصر و کسریٰ کے تخت ہلا دیئے تمام دنیا کو تہ و بالا کر دیا، روئے زمین میں کوئی قوم ایسی نہیں تھی جو ان کے مقابلہ میں ثابت قدم رہ سکے بہت تھوڑے عرصہ میں تمام دنیا میں اسلام پھیل گیا۔

مثلاً اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہندوستان میں مبعوث کیا جاتا تو ہندوستان کی اصلاح میں آپ کو اتنی دقت پیش نہ آتی جتنی عرب کی اصلاح میں پیش آئی، لیکن اسلام رہتا ہندوستان ہی میں، ہندوستان کے حدود سے آگے تجاوز نہ کرتا، تو گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو تکلیف کم ہوتی لیکن آپ کی بعثت کا جو مقصد تھا (یعنی تمام دنیا میں اسلام پھیلانا) وہ ہرگز حاصل نہ ہوتا کیونکہ ہندوستان کے لوگ اس قابل نہیں تھے کہ بڑی بڑی بہادر قوموں کا مقابلہ کر سکتے۔ یہ عرب ہی کا کام تھا کہ فاقوں کے مارے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے ہیں لیکن جب تلوار لیکر کھڑے ہوتے ہیں تو پہاڑ ہلا دیتے ہیں، غرض ان کے کارنامے محتاجِ بیان نہیں ہیں۔

اسی حکمت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خداوند تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیبؐ کو قطعۂ عرب

میں مبعوث فرمایا اور ان کے ذریعہ سے اسلام دنیا میں پھیلایا۔

تقریر مذکورہ بالا سے بعض مخالفین کا وہ شبہ بھی زائل ہوگیا جو آپ کی بعثت کے عام ہونے پر کیا جاتا ہے بوجہ ان نصوص کے جن میں آپ کا خاص عرب کے لیے مبعوث ہونا مذکور ہے، جیسا کہ ان دو آیتوں میں جو اوپر گذر چکی ہیں کیونکہ ان نصوص میں تخصیص باعتبار بعثت اولاً و بالذات کے ہے جیسا کہ اوپر مفصل گذر چکا ہے نہ اس وجہ سے کہ آپ باقی لوگوں کے لیے نبی نہیں تھے، بلکہ آپ کی بعثت کا عام ہونا دلائل سے ثابت ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمّی ہونے کی حکمت

جب یہ فیصلہ ہوچکا کہ آپ کی بعثت کے لیے قطعہ عرب ہی کا منتخب ہونا مصلحت ہے تو اس کے بعد مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ آپ امی ہوں لکھے پڑھے نہ ہوں بچند وجوہ:

(۱) عرب چونکہ امّی تھے اور امیوں کی طرف نبی بھی امی ہونا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس صورت میں افادہ و استفادہ میں آسانی ہوگی اس لیے کہ جس قدر مرسل و مرسل الیہم میں اتحاد زیادہ ہوتا ہے اسی قدر افادہ و استفادہ میں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں نبی کا طرزِ کلام ان کے محاورات و عادات کے بالکل موافق ہوتا ہے ان کو سمجھنے میں دقت نہیں پیش آتی اور آپس میں اُنس بھی زیادہ ہوتا ہے اور اگر آپ لکھے پڑھے ہوتے تو ان لوگوں کو آپ سے اُنس بھی کم ہوتا اور آپ کا کلام بھی ان کے مذاق کے مطابق نہ ہوتا اس وجہ سے ان کو افادہ و استفادہ میں دقت ہوتی اسی حکمت کی طرف اشارہ ہے اس آیت میں (ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم) سورہ جمعہ، ترجمہ: اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا)

(۲) مصلحتِ وقت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ کو معجزہ کتاب کی صورت میں دیا جائے جس کی تشریح معجزات کے بیان میں گذر چکی ہے پس اگر آپ لکھے پڑھے ہوتے تو بظاہر اس شبہ کی گنجائش ہوتی کہ آپ چونکہ لکھے پڑھے ہیں لہٰذا کتابوں کو دیکھ بھال کر اپنی طرف سے جمع کر لیتے ہیں گو تحدی کے بعد جب مقابلہ سے عاجز آجاتے تو یہ شبہ بھی زائل ہو جاتا لیکن قبل از تحدی اس کی گنجائش ہوتی لیکن آپ کے امی ہونے کی صورت میں اس شبہ کی ابتداءً ہی جڑ کٹ جاتی ہے جیسا کہ آیت (وما کنت تتلوا من قبلہ الخ) میں اس کی تقریر گذر چکی۔

(۳) اگر آپ لکھے پڑھے ہوتے تو آپ کو کتاب بھی لکھی لکھائی یکدم دے دی جاتی جیسا کہ آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کو دی گئی تھیں لیکن قوم قریش کی درشتی و سخت مزاجی اس قدر حد سے بڑھی ہوئی تھی کہ آپ سے کتاب کو چھین کر پارہ پارہ کر دیتے آپؐ کے ہاتھ میں ایک ورق بھی نہ رہنے دیتے، اسی مصلحت کی وجہ سے جب تک فرعون غرق نہیں ہوا موسیٰ علیہ السلام کو کتاب نہیں دی گئی، غرض قوم قریش کی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے مصلحت کا تقاضا یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھا پڑھا نہ بنایا جائے تاکہ لکھی ہوئی کتاب کی ضرورت پڑے بلکہ اُمی رکھ کر تھوڑا تھوڑا کر کے کتاب یاد کرادی جائے تاکہ آپؐ کے قلب میں محفوظ رہے کسی شخص کا اس پر قابو ہی نہ ہونے پائے اسی کے متعلق ارشاد ہے سورہ شعراء کی اس آیت میں (نزل بہ الروح الامین علی قلبک) ترجمہ! اس (قرآن شریف) کو ایک امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے آپؐ کے قلب پر) اس کے علاوہ اور بھی کئی آیتوں میں اس کا ذکر ہے کہ آپؐ کو کتاب لکھی لکھائی نہیں دی گئی بلکہ آپؐ کے قلب پر اتار دی گئی ہے اور اس کا محلِ نزول آپ کے قلب مبارک کو قرار دیا گیا ہے۔

اس تقریر سے کفار کا ایک شبہ بھی زائل ہو گیا جو بوجہ نادانی کے آپؐ پر کرتے

تھے جو سورہ فرقان کی اس آیت میں مذکور ہے (وقال الذین کفروا لولا نزل علیہ القرآن جملۃ واحدۃ) ترجمہ: کہ آپ پر قرآن شریف دفعۃً واحدۃً کیوں نہیں اتارا گیا مثل توراۃ وغیرہ کے۔

اس اعتراض سے کفار کا مطلب یہ تھا کہ اگر یہ کتاب خدا کی طرف سے ہوتی تو پھر اس کو تدریجاً نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی اس سے تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود سوچ سوچ کر تھوڑا تھوڑا بنا لیتے ہیں۔

اور تقریر مذکورہ بالا سے اس اعتراض کا ازالہ اس طرح پر ہوا کہ جب یہ بات طے ہو گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امی ہونا ہی مصلحت ہے تو پھر ظاہر ہے کہ آپ کو کتاب یک دم لکھی لکھائی دینا خلافِ مصلحت ہے کیونکہ آپ اس کو پڑھ نہیں سکتے بلکہ تدریجاً آپ کو یاد کرا دی جائے گی جیسا کہ اُمّی آدمی کے پڑھانے کا طریقہ ہے کہ اس کو تھوڑا سا سبق دے دیا جاتا ہے جب اس کو یاد کر لیتا ہے تو دوسرا سبق دے دیا جاتا ہے نہ تو وہ یک دم ساری کتاب کو یاد کر سکتا ہے اور نہ لکھی ہوئی پڑھ سکتا ہے اور آپ سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام تھے وہ چونکہ لکھے پڑھے ہوتے تھے لہٰذا ان کو دفعۃً واحدۃً کتاب دے دی جاتی تھی۔

اس حکمت کی وجہ سے اس کی ضرورت ہوئی کہ آپ کو تھوڑا تھوڑا کر کے قرآن شریف یاد کرایا جائے ورنہ آپ برداشت نہیں کر سکیں گے اور گھبرا جائیں گے۔ یہی حکمت ارشاد فرمائی ہے باری تعالےٰ نے کفار کے اعتراض کے جواب میں (کذالک لنثبت بہ فؤادک ورتلناہ ترتیلا) ترجمہ: کہ اس طرح (تدریجاً) اس لیے (ہم نے نازل کیا ہے تاکہ ہم اس کے ذریعہ سے آپ کے دل کو قوی رکھیں اور اسی لیے) ہم نے اس کو بہت ٹھہرا ٹھہرا کر اتارا ہے (حتیٰ کہ تئیس سال میں پورا ہوا) اور تھوڑا تھوڑا کر کے اتارنے میں کئی وجہ سے آپ کی تقویتِ قلب ہے۔

(۱) یاد کرنے میں آسانی، ورنہ کتاب ضخیم کا بے لکھے پڑھے آدمی کو دفعۃً یاد کرنا عادۃً دشوار ہے اور اس کو دیکھ کر طبیعت کا پریشان ہونا امر طبعی ہے اور تدریج کی صورت میں دل قوی رہتا ہے۔

(۲) جب کفار کوئی اعتراض یا ناگوار معاملہ کرتے تب ہی آپ کی تسلی نازل ہو جاتی اس میں زیادہ تقویت قلب ہوتی ہے بہ نسبت اس کے کہ ایک کتاب آدمی کے پاس ہو اور وقت پر اس میں سے مضمون تلاش کر کے کام میں لاوے۔

(۳) بار بار پیغامِ خداوندی کا آنا اور سلسلہ مراسلت کا جاری رہنا شہادت ہے معیتِ خداوندی کی جو مدار اعظم ہے تقویتِ قلب کا وامثال ذالک۔

اعتراض

ممکن ہے کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ گو بے لکھے پڑھے آدمی کا ایک دم کتاب ضخیم کو یاد کر لینا عادۃً دشوار ہے لیکن خداوند تعالےٰ جب انبیاء علیہم السلام کو معجزات عطا فرماتے ہیں جو عادت کے خلاف ہوتے ہیں تو ایک معجزہ یہ بھی عطا فرما دیتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب یکدم یاد کرا دیتے اور اگر خواہ مخواہ تدریجاً ہی نازل فرمانی تھی تو اتنی لمبی مدت کیوں لگائی بلکہ روزانہ ایک ایک رکوع نازل کر کے ایک دو سال میں قصہ ختم کر دیتے تو اس صورت میں بھی آسانی سے یاد ہو سکتا تھا۔

جواب

تقویت قلب کے جو وجوہِ ثلاثہ بیان ہوئے ہیں ان میں سے پہلی وجہ تو بے شک اعتراض کی دونوں صورتوں میں حاصل ہو جاتی ہے لیکن دوسری و تیسری وجہ تقویت کی دونوں صورتوں میں فوت ہو جاتی ہے کیونکہ سلسلۂ اعتراضات تو آپ کی تمام عمر تک جاری

رہے گا، لہٰذا خداوند تعالیٰ کی طرف سے شہادت معیت کی بھی تمام عمر ضرورت رہے گی اسلیے مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ سلسلہ مراسلت کا بھی تمام عمر جاری رہے، اس لیے تئیس برس میں قرآن شریف کی تکمیل ہوئی اور یہ معنی (ورتلناہ ترتیلا) کے صاحب کشاف نے کیے ہیں تو گویا (ورتلناہ ترتیلا) کے اضافہ کرنے سے اعتراض کی دونوں صورتوں میں تقویت کے بعض وجوہ فوت ہو جاتے ہیں لہٰذا مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ تئیس سال کی مدت میں نزول قرآن شریف کو پورا کیا جائے۔

تمام شد ضرورتِ رسالت

(حصّہ اوّل و دوم)

فہرست مضامین کتاب ضرورت رسالت مکمل ومدلّل

مصنفؒ کی دیگر تصانیف

- تبلیغی دستور العمل ——— حصہ اوّل ۱؎
- تبلیغی دستور العمل ——— حصہ دوم ۲؎
- تبلیغی دستور العمل ——— حصہ سوم ۳؎
- تبلیغی دستور العمل ——— حصہ چہارم ۴؎
- تبلیغی دستور العمل ——— حصہ پنجم ۵؎
- تبلیغی دستور العمل ——— حصہ ششم ۶؎
- تبلیغی دستور العمل ——— حصہ ہفتم ۷؎
- تبلیغی دستور العمل ——— حصہ ہشتم ۸؎
- تبلیغی دستور العمل ——— حصہ نہم ۹؎
- تحفۂ پاکستان ———
- تفسیر سورۂ فاتحہ ———
- تیرہ مسائل ———
- چودہ مسائل ——— زیرِ طبع
- الجہاد فی سبیل اللہ ——— زیرِ طبع

مطبوعہ:
گلستان پریس
جناح مارکیٹ سرگودھا

عقائد کی اصلاح کرنیوالی کتب

الدر المنثورہ از مولانا محمد امیر مرحوم ۲۴/=

دعوۃ الحق 〃 〃 〃 ۷/۵۰

الاقوال المرضیہ مع القبر الشرعی } از علامہ نیلوی ۱۲/=

رد منکرات حیات الاموات از علامہ نیلوی ۴/=

التوحید از مولانا محمد امیر مرحوم ۴/=

فتح الرحمان فی قیام رمضان از علامہ نیلوی ۱۰/=

بشریت نبوی ص از علامہ نیلوی ۲/۵۰

معراج النبی ص 〃 ۴/=

ورق منشور فی احکام الموتی والقبور 〃 ۱۲/=

ضیاء حق رسائل خمسہ 〃 ۵/=

پیران پیر تاریخ کی روشنی میں 〃 ۱/۵۰

المعارف فی تحریم المزامیر والمعازف 〃 ۵/=

خیر الکلام فی تقبیل الابہام 〃 ۵/=

ندائے حق جزء اول از جلد اول 〃

دوسرا ایڈیشن زیر طبع

ندائے حق جزء ثانی از جلد اول زیر طبع

ندائے حق جلد ثانی ۴۵/=

اپیل فول از علامہ نیلوی ۱/=

رذیل عادتیں از علامہ نیلوی ۱/=

خلاصہ القرآن بار بط 〃 ۲/=

تفسیر جواہر القرآن کامل از شیخ القرآن ۳۲۰/=

جواہر التوحید 〃 ۳۹/=

اقامۃ البرہان از علامہ سجاد بخاری ۲۶/=

الآیات البینات از نعمان بن محمود آلوسی ۱۲/=

تحفۃ الہند از مولانا عبید اللہ نومسلم ۱۵/=

کتاب التوحید جلد ۱، ۲، ۳ از جاجروی ۸۴/=

مقدمہ کتاب التوحید ۲۵/=

تفسیر بے نظیر محشی از مرشدنا مولانا حسین علی رح ۱۰/۲۵

شجرہ مبدعات از مولانا سید عنایت اللہ شاہ ۵/=

ادخال الباغین انٹرویو 〃 ۵/=

غیب دانی از علامہ نیلوی ۴/=

تفسیر آیت خاتم النبیین ص از علامہ نیلوی ۵/=

〃 〃 رفع عیسیٰ ع 〃 ۸/=

مرزا قادیانی کی تضاد بیانی 〃 ۲/=

صلوٰۃ وسلام بر نبی ص 〃 ۲/=

سیرت سید المرسلین از عبد المجید شاکر مرحوم ۳۰/=

تفاسیر، احادیث، درسی عربی، اردو اسلامی کتب با رعایت خرید فرمائیں۔

المکتبۃ الحسینیہ جامعہ ضیاء العلوم بلاک نمبر ۱۸ سرگودھا